مولانا محمد اسماعیل ریحان رحمہ اللہ کی "تاریخِ امتِ مسلمہ" کا

تحقیقی جائزہ

(حصہ اوّل)

تالیف حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ

تقدیم محمد فہد حارث

حارث پبلی کیشنز

مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب کی

''تاریخ امت مسلمہ'' کا

تحقیقی جائزہ

(حصہ اول)

تالیف:

حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ

تقدیم:

محمد فہد حارث

پبلشر:

حارث پبلی کیشنز

حارث پبلی کیشنز

جملہ حقوق اشاعت برائے حارث پبلی کیشنز محفوظ ہیں

مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب کی ''تاریخ امت مسلمہ'' کا

تحقیقی جائزہ

(حصہ اول)

تالیف: ..... حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ

تقدیم: ..... محمد فہد حارث

طبع جدید: ..... اگست 2020ء

تعداد کتاب: 1100

کمپوزنگ: ..... مسز محمد عمران

قیمت: .....

صفحات: 290

پبلشر:

حارث پبلی کیشنز

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	مقدمہ از محمد فہد حارث	11
2	چند گزارشات جناب اسماعیل ریحان صاحب کے بیان کردہ اصولوں پر	31
3	نمبر ۱: تاریخ بالروایۃ	31
4	نمبر ۲: تاریخ بالدرایۃ	32
5	نمبر ۳: تاریخ بالروایۃ والدرایۃ	32
6	جناب اسماعیل ریحان صاحب نے تاریخ نویسی کا کون سا انداز اپنایا	33
7	تبصرہ	34
8	اسلامی تاریخ میں اسناد کی اہمیت	35
9	تبصرہ	37
10	تبصرہ	37
11	اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کی چند جھلکیاں	39

12	سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور آپ کو شہید کرنے والوں کے بارے میں اسماعیل ریحان صاحب کا ''نرم'' موقف اور نادر تحقیق	49
13	روایت ''سنداً ضعیف'' لیکن پھر بھی ''بلاشبہ قابل قبول''؟ مگر کیسے؟	52
14	عطاء بن یسار، یا عطاء بن ابی مسلم خراسانی؟	54
15	پہلی سند	57
16	دوسری سند	57
17	تیسری سند	57
18	اسماعیل ریحان صاحب اور فن اسماء الرجال	61
19	بغاوت کسے کہتے ہیں؟	65
20	عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت	73
21	کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ہونے والے اجتہادی مشاجرات واختلافات کے بارے میں بعد والوں کو قطعی فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے؟	83
22	ہمارا تبصرہ	85
23	اسماعیل ریحان صاحب، اپنے ہی اصولوں کا خون کرتے ہیں	101
24	''صلح حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہما'' کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کی حقیقت	109
25	چند ''کٹ حجتیاں'' اور ان کا مختصر جائزہ	117
26	کٹ حجتی نمبر ا	117
27	جواب	118

28	کٹ حجتی نمبر ۲	120
29	جواب	121
30	کٹ حجتی نمبر ۳	121
31	جواب	121
32	جناب اسماعیل ریحان صاحب اور خلافت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما	123
33	سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل	129
34	سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور آپ کی نماز جنازہ	135
35	کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر باغیوں کا دباؤ تھا؟	141
36	تبصرہ	142
37	جناب اسماعیل ریحان کی تاریخ دانی کی چند جھلکیاں	144
38	حیی بن اخطب کا قتل اور اسماعیل ریحان صاحب کا ایک عجوبہ	145
39	نتیجہ	146
40	سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ، مہاجر یا انصاری؟ جناب اسماعیل ریحان صاحب کا ایک اور ''تجدیدی کارنامہ''	147
41	امام طبری اور عباسی خلیفہ ''القاہر باللہ''، اور اسماعیل ریحان صاحب کی ''مستند ترین'' تاریخ	153
42	کیا یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بے ادبی و گستاخی تو نہیں؟ اہل علم سے ایک سوال	155
43	ہمارا سوال	159
44	بنی امیہ دشمنی اور اسماعیل ریحان صاحب	161

45	کیا خروج اور بغاوت کی سزا کے طور پر قتل کرنا جائز نہیں؟	163
46	اسماعیل ریحان صاحب اور دور مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم	147
47	کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سنہ ''۶۳ ہجری'' میں زندہ تھے؟	176
48	پہلا اسلامی بحری بیڑہ اور قسطنطینیہ پر پہلا حملہ، اور اسماعیل ریحان صاحب کی تخلیق کردہ نئی تاریخ	186
49	حوالہ میں خیانت	188
50	کیا ''مضیق قسطنطینیہ'' تک پہنچنے کا مطلب ''قسطنطینیہ شہر'' پہنچنا ہے؟	192
51	عمومی تبصرہ	194
52	اسماعیل ریحان صاحب کی غلط بیانی	198
53	قسطنطینیہ پر حملے	203
54	خلفاء راشدین چار؟ یا پانچ؟ اسماعیل ریحان صاحب کی ''مستند تاریخ'' کی روشنی میں	208
55	تیس سالہ خلافت کہاں سے کہاں تک؟	210
56	خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	210
57	خلافت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ	210
58	خلافت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ	210
59	خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ	211
60	خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ	211
61	ضروری نوٹ	213

62	باغیوں کے خلافت ریاستی طاقت کے استعمال کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت، اور جناب اسماعیل ریحان صاحب کے تضادات	216
63	جناب اسماعیل ریحان کا علامہ ابن خلدون کی عبارت سے غلط استدلال	233
64	ایک کٹ حجتی اور اس کا جائزہ	245
65	بارہ خلفاء والی حدیث اور اسماعیل ریحان صاحب کی ''نئی'' تحقیق	250
66	اسماعیل ریحان صاحب کا عجوبہ	258
67	بنی امیہ دشمنی	260
68	سوال نمبر ۱	261
69	سوال نمبر ۲	262
70	ظاہری بغاوت، صوری بغاوت اور حقیقی بغاوت، اور جناب اسماعیل ریحان صاحب کی ایک تلبیس کا ازالہ	264
71	اسماعیل ریحان صاحب کے ساتھ میری ایک ملاقات کا حال	266
72	''صورتاً'' بغاوت کا مطلب کیا؟	269
73	سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی فقاہت وبصیرت	275
74	تبصرہ	277
75	مروان بن حکم کا ابن زیاد کو خط	278
76	کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت، امت کے بہترین فرد کو ملی؟	281
77	تبصرہ	281
78	کیا اپنے خود ساختہ مفرضوں کا نام تاریخ ہے؟	284
79	اسماعیل ریحان صاحب کا عجوبہ	290

مقدمہ

از محمد فہد حارث

مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا موضوع ہماری تاریخ کا ایسا میدانِ خارزار ہے کہ جس نے بھی اس میں قدم رکھا، مشکل سے ہی بسلامت اپنا دامن جانبداری کے کانٹوں سے بچا کر اس کو پار کر سکا۔ دراصل بچپن سے ہمارے ذہنوں میں فضائل کی روایات کے زیرِ اثر ایک ایسا تخیل پیدا کر دیا جاتا ہے جہاں ہمارے نزدیک ایک گروہِ صحابہ رضی اللہ عنہم معصوم عن الخطا جبکہ دوسرا خاطی و باغی ٹھہرتا ہے۔ ہم، جو اپنے اکابر و علماء کے لیے یہ سننا برداشت نہیں کر سکتے کہ ان سے فلاں معاملے میں خطا یا غلطی ہوگئی، بڑے طمطراق اور جوش و جذبہ کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف خطائیں منسوب کر کے ان کی لغزشوں کو بیان کرنا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اگر عدالتیں لگانے کا کسی کو حق حاصل تھا تو وہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو تھا۔ جس متعلق خیر القرون کے مبارک دور کی ان پاکیزہ ہستیوں کے درمیان اختلاف در آیا اور وہ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے، اس بابت ہم ۱۴۰۰ سالوں بعد عدالتیں لگا کر ایک گروہِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو خاطی اور دوسرے کو حق پر قرار دینے کی جسارت کیوں کر کر سکتے ہیں۔ پھر اس سلسلے میں چونکہ ہمارے پاس نہ صحیح تاریخ سے کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کوئی نظائر، سو لے دے کر ہم علماء کے اقوال کو حجت بنا لیتے ہیں اور اسی پر دورِ خیر القرون کے لوگوں کی زندگیوں اور سیرت کے فیصلے صادر کر دیتے ہیں۔ جبکہ ساتھ

ہمارا ماننا یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ان عالی قدر علماء وفقہاء نے اس طور سے تاریخ کی تنقیح کا کام کیا ہی نہیں، جس طور سے ان حضرات نے عقائد واعمال کے عنوانات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ تاریخ سے متعلق دو باتیں جان لیجئے تو تاریخ کے بیشتر مباحث سمجھنے میں کافی آسانی ہو جائے گی:

ا۔ تاریخ کی تنقیح کا کام کبھی اُس طرح سے نہیں ہوا جیسا کہ ہمارے فقہاء ومحدثین فقہی احکام واحادیث کی تنقیح کا کام کرتے آئے ہیں۔ محدثین کے لئے تاریخ بس یہ جاننے کا نام تھا کہ کون سا راوی کب پیدا ہوا، کہاں رہا اور کب وفات پا گیا۔ مؤرخین نے تاریخ مرتب کرنے سے زیادہ "موادِ تاریخ" جمع کرنے پر زور دیا۔ اسی سبب آپ کو علامہ ابن جریر طبری کی "تاریخ الامم والملوک" سے لے کر علامہ ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ کی "البدایہ والنہایہ" تک میں متضاد روایات مل جاتی ہیں۔ جب کوئی شخص مسلمانوں میں فیصل شدہ عقائد وفقہی مسائل میں تجدد کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا ردّ اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ ان مباحث پر چودہ سو سالوں سے امت تنقیح وبحث کا کام کرتی آرہی ہے اور اس سلسلے میں جس قدر محنت ہو سکتی تھی، اس قدر محنت سے مسائل واحکامات کا استنباط کر دیا گیا ہے۔ جبکہ تاریخ کے معاملے میں ایسا دعویٰ کبھی کسی نے نہیں کیا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "منهاج السنة" میں تاریخی واقعات سے متعلق جو کچھ لکھا وہ تاریخ کے بعض واقعات سے متعلق ان کی رائے تھی۔ اس رائے کو حتمی قرار دے کر اس کے علاوہ کسی اور تحقیق کو قابلِ رد سمجھنا، تاریخ سے جہالت کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ "دلیل سینڈروم" کی شاہکاریاں فقہی احکامات سے متعلق تو چل سکتی ہیں لیکن تاریخ سے متعلق وہ

بالکل بے کار ہیں کیونکہ تیرہ سو سالوں میں تاریخ کی تنقیح کا کام احادیث وفقہ کی طرح ہوا ہے، ایسا دعویٰ آج تک کسی عالم نے نہیں کیا اور نہ کرسکتا ہے کیونکہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکا۔ اسی سبب علامہ معلمی الیمانی رحمہ اللہ جیسے بالغ النظر محدث لکھتے ہیں:

ان حاجة التاريخ الى معرفة احوال ناقلى الوقائع التاريخية، اشد من حاجة الحديث الى ذلک، فان الكذب و التساهل فى التاريخ اكثر۔ ①

یعنی" تاریخ کو حدیث سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ تاریخی واقعات نقل کرنے والے راویوں کی معرفت حاصل کی جائے کیونکہ جھوٹ اور تساھل کا وجود تاریخ ہی میں زیادہ ہے۔"

اسی طور کا کلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے:

" مورخین کی روایتیں تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے اور ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے، نہ انفصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام کیا بھی ہے تو عموماً ان میں ہر غث وثمین سے ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے خواہ ابن اثیر ہوں یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہوں یا ابن سعد۔" ②

۲۔ تاریخ نقلِ اقوال علماء کا نام نہیں ہے۔ تاریخ نقلِ روایتِ صحیحہ کا نام ہے۔ تاریخ کے معاملے میں علماء کے اقوال صرف وہی لوگ پیش کرتے ہیں جو

① علم الرجال و اهمية للمعلمى اليمانى صفحه ۲۵۷

② مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا صفحہ ۲۶۶

فریقِ مخالف کے تحقیقی دلائل سے عاجز ہو کر اپنے مرجوح تاریخی نظریات کے لئے کوئی راہِ فرار نہیں پاتے اِلّا یہ کہ علماء کے غیر محقق اقوال کا سہارا لیا جائے۔ ایسے میں بہت سے وہ حضرات جو تقلید کی قباحتوں پر دوسرے مسالک پر پھبتیاں کستے نظر آتے ہیں، تاریخ کے معاملے میں فوراً اقوالِ علماء کے ضمن میں وہی تقلیدی قلادہ گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ سو احادیث کی طرح تاریخ میں بھی روایتِ صحیحہ سے استشہاد کرنے کی عادت ڈالئے۔ ان شاء اللہ اسلامی تاریخ کی انتہائی نکھری صورت نکل کر سامنے آئے گی۔ پھر یہ حضرات یہ بات جان لیں کہ مشہور عرب محقق محمد صبحی حسن حلاق نے جب تاریخ طبری پر تنقیح کا کام شروع کیا تو محض ایک جلد میں صحیح تاریخ طبری مرتب ہوئی جبکہ بقیہ کئی جلدوں میں ضعیف تاریخ طبری مرتب ہوئی ہے۔ یہ حال ہے تاریخ کے اس بنیادی ماخذ کی تنقیح کا جس کی بنیاد پر ہم مشاجرات کی عدالتیں سجا کر سیدنا معاویہ و سیدہ عائشہ و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کو پوری شدومد سے خاطی و باغی قرار دیتے ہیں۔ (فاعوذ باللہ من ذالک)

مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق تین مواقف:

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ظلماً شہید ہو جانے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہنگامی حالات میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہم عصر امت میں قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کو لے کر تین مواقف نے جنم لیا۔ یہ تین مواقف تین گروہوں کی صورت میں ظاہر ہوئے جن میں سے ہر ایک گروہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی۔ پہلا گروہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے موقف کے حامیوں کا تھا جن کا کہنا تھا کہ پہلے بیعت خلافت کی تکمیل ہو جائے، اس کے بعد قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے نپٹ کر

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کی سبیل کی جا سکے گی۔

دوسرا گروہ سیدہ عائشہ، عشرہ مبشرہ سیدنا طلحہ بن عبیداللہ و سیدنا زبیر بن العوام اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہم اور ان کے موقف کے حامیوں کا تھا جو کہ طالبین قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا گروہ کہلاتا تھا اور جن کا ماننا تھا کہ چونکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ظلماً شہید کیے گیے ہیں، سو اِن کی بیعت کا طوق اس وقت تک ہمارے گلوں میں ہے جب تک کہ ان کا قصاص نہ لے لیا جائے۔ اس دوسرے گروہِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے اس موقف کے صائب ہونے پر ان حالات سے بھی تقویت مل رہی تھی جن میں وہ دیکھ رہے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں پر قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کے باوجود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سمیت ایک ایک عاملِ عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی کے پروانے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قلم سے جاری کروائے جا رہے ہیں۔ ایسے میں طالبینِ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر ہم نے ایسے حالات میں قصاص کے مطالبے کو مؤخر کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو پھر کبھی قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کی نوبت نہ آئے گی کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حکومت میں خود یہ قاتلین اونچے عہدوں پر موجود آپ رضی اللہ عنہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہیں۔ ساتھ ہی ان اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر بیعت رضوان بھی تھی جس میں انتہائی نامساعد حالات میں بغیر کسی اسلحہ اور سامانِ حرب کے اپنے مرکز مدینہ سے میلوں دور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی بیعت لی تھی جس کو قرآن نے بیعت شجرہ قرار دے کر اس بیعت کو توڑنے والوں کو وعید سے ڈرایا تھا۔ سورۃ الفتح آیت ۱۰ میں اس بیعت قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ

سے متعلق یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾

یعنی" بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہوگا اور جو اس عہد کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے سو عنقریب اللہ اس کو بڑے اجر سے نوازے گا۔"

گویا قرآن کی اس نص کے تحت طالبینِ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص" نامساعد حالات" میں بھی واجب و معجّل تھا۔

جبکہ تیسرا گروہ ان غیر جانبدار صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا جنہوں نے نہ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کی اور نہ ہی سیدہ عائشہ و سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کا ساتھ دیا۔ اس گروہِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی پہلے دونوں گروہوں کی طرح جلیل القدر اصحاب کی اکثریت موجود تھی جن میں مہاجرین میں سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا صہیب بن سنان رومی، سیدنا اسامہ بن زید، سیدنا قدامہ بن مظعون، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ اجمعین اور انصار میں سیدنا حسان بن ثابت، سیدنا عبداللہ بن سلام، سیدنا کعب بن مالک، سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا نعمان بن بشیر، سیدنا زید بن ثابت، سیدنا رافع بن خدیج، سیدنا فضالہ بن عبید، سیدنا کعب بن عجرہ، سیدنا سلمہ بن سلامہ رضوان اللہ اجمعین جیسے اساطین امت شامل تھے۔

ان تینوں گروہِ صحابہ میں سے کسی پر بھی جمہور کی اصطلاح منطبق نہیں کی جاسکتی کیونکہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ان میں سے کسی کو بھی قابلِ ذکر اکثریت حاصل نہ تھی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک امت میں یہی صورتحال برقرار رہی یہاں تک کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خلافت کی منتقلی کے بعد امت میں موجود انتشار رفع ہوا اور اس سال کو عام الجماعۃ کا نام دیا گیا۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان تین گروہوں کی اتباع میں عصرِ حاضر میں بھی امت میں مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق تین مواقف پائے جاتے ہیں۔ البتہ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے برخلاف فی زمانہ ان تین نظریات میں سے پہلے نظریہ کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمہور کی تائید حاصل ہوگئی ہے جبکہ باقی دو نظریات کے حاملین پہلے نظریہ کے حاملین کے مقابلے میں کسی قدر اقلیت میں ہو گئے ہیں۔ پہلے نظریئے کو جو جمہور کی تائید حاصل ہوئی تو اس میں بہت کچھ فضائل کی روایات اور ایک خاص ذہنی میلان کے ساتھ تاریخ کی تدوین کا کام تھا جس میں اہلسنت میں اولین متداول ہونے والی موادِ تاریخ کی کتابوں کے بیشتر مؤرخین اور رواۃِ تاریخ کے شیعی رجحان کو کوئی صاحبِ علم نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اب چونکہ کتب اسماء الرجال میں یہ بات صراحت سے منقول ہے کہ قرونِ اولیٰ میں جب کسی راوی کی بابت کہا جاتا تھا کہ وہ شیعہ ہے تو اس سے مراد رافضی نہیں بلکہ سیاسی طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کا طرفدار ہونا ہوتا تھا، سو جب بھی ایسے شیعی رجحان رکھنے والے رواۃ نے تاریخی واقعات روایت کیے تو انہوں نے بعینہٖ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو صائب اور دوسرے دو گروہوں کو خطائے اجتہادی کا مرتکب قرار دیا۔

خیر آمدم برسرِ مطلب! اس لمبی تمہید کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ جب کسی معاملے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف رونما ہو جائے اور یہ اختلاف کسی ایک صحابی کا جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہ ہو بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی معتد بہ تعداد کا آپس میں ہو تو پھر ان میں سے کسی بھی ایک موقف کی پیروی یا اس کو اختیار کرنا کسی صورت میں گمراہی یا غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس اگر آج کوئی شخص جمہور کی رائے کو احترام دیتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مشاجرات کے مباحث میں احق مانتا ہے اور دوسرے دو گروہوں کو خطائے اجتہادی کا مرتکب، تو اس سے اختلاف ضرور رکھا جا سکتا ہے لیکن اس کو گمراہ یا قطعیت کے ساتھ غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور بعینہٖ یہی معاملہ ان حضرات کا بھی ہے جو مشاجرات کے مباحث میں دوسرے گروہ کی پیروی میں سیدہ عائشہ و سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے موقف کو احق اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خطائے اجتہادی پر سمجھتے ہیں کیونکہ بہر حال ان کے اس موقف کے پیچھے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک معتد بہ جماعت کے موقف کی پیروی ہی ہے۔ سو یہ موقف رکھنے کے سلسلے میں ایسے حضرات کو مطعون کرنا یا ان پر گمراہی کا فتویٰ صادر کرنا سراسر غلط اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے معتد بہ گروہ کو معاذ اللہ گمراہ باور کروانے کے مترادف ہوگا۔ اسی طرح مشاجرات کے باب میں اگر کوئی تیسرے یعنی غیر جانبدار گروہِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی میں اس متعلق مکمل کف لسان کرتا ہے اور مقدم الذکر دونوں گروہوں میں سے کسی کے صائب اور غیر صائب ہونے کا فیصلہ کرنے کا قائل نہیں ہے تو ایسے حضرات پر بھی گمراہ ہونے یا غلط ہونے کا فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسے حضرات سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا عبداللہ بن سلام، سیدنا صہیب بن سنان رومی، سیدنا اسامہ بن زید، سیدنا قدامہ بن مظعون، سیدنا مغیرہ

بن شعبہ، سیدنا حسان بن ثابت، سیدنا کعب بن مالک، سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا نعمان بن بشیر، سیدنا زید بن ثابت، سیدنا رافع بن خدیج، سیدنا فضالہ بن عبید، سیدنا کعب بن عجرہ، سیدنا سلمہ بن سلامہ رضوان اللہ اجمعین جیسے اساطین امت کی موقف کے حامی و پیروکار ہیں۔ اور یہ راقم بھی اسی تیسرے موقف کا قائل اور اسی موقف کو احق سمجھتا ہے۔

خلافت راشدہ اور خلافت غیر راشدہ:

بنو بویہ، عبیدی اور دیلمی حکمرانوں کے بعد مسلمانوں کے سیاسی معاملات کو لے کر امت میں کئی طرح کے بدعی نظریات رواج پا گئے، انہیں میں ایک نظریہ خلفائے راشدین اور ان کی تعداد کو چار تک محدود کرنے کا تھا۔ عہد خیر القرون میں یہ بحث کبھی چلی ہی نہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک کی خلافت، خلافت راشدہ تھیں اور مابعد کی حکومتیں ملوکیت۔ صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین و اتباع تابعین رحمہم اللہ کے ادوار میں نہ ہی ضعیف حدیث سفینہ کے تحت کسی نے خلافت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ختم نہ کیا اور نہ حدیث عمار رضی اللہ عنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باطل پر گردانا۔ یہ تو بنی بویہ کے زمانے میں جب بغداد شہر کی دیواروں پر سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا معاویہ، سیدنا عمرو بن العاص اور سیدنا مروان رضوان اللہ اجمعین کی جناب میں تبرّے لکھے گئے جن کے ردعمل کے تحت بغداد کی اہلسنت عوام اور روافض حکمرانوں کے مابین فساد و دنگے شروع ہو گئے تو تب کہیں جا کر ان بدعی نظریات کو اسلامی تعلیمات کے اندر در آنے کا موقع ملا سکا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں " خلافت راشدہ" و ''خلافت موعودہ'' وغیرہ جیسی اصطلاحات موجود ہی نہ تھیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم و

تابعین رحمہم اللہ میں سے کسی سے ایسی باتیں مستند طریقے سے ثابت ہی نہیں کہ " خلافت راشدہ" یا" خلافت موعودہ" صرف شروع کے چار خلفاء میں مقیّد ہے۔ یہ اصطلاحات قرن اول کے بعد کی ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت اکثریت میں تھے، جنہوں نے آخری وقت تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے احتراز کیا اور سیاسی معاملات میں غیر جانبدار رہے۔ ان صحابہ میں سابقون الاولون بھی موجود تھے تو بدری صحابہ بھی، حدیبی بھی تھے تو بعد فتح مکہ ایمان لانے والے بھی۔ اب اگر ان تمام حضرات کے نزدیک" خلافت راشدہ" کی کوئی اصطلاح اسی معنی میں ہوتی جو بنی بویہ کے دور کے بعد ایجاد ہوئی، اور آج تک امت میں رائج ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ علم رکھنے کے باوجود کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد و موعود ہیں، ان کی بیعت سے تخلف اور احتراز کیا۔ اب ایسی صورتحال میں ان تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر معاذ اللہ کیا ناصبیت کا فتویٰ لگے گا جو کہ آج مفت میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور اگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان اصطلاحات سے مانوس نہ تھے تو اس سے یہی ثابت ہوتا کہ اُس وقت تک یہ اصطلاحات عالم وجود میں نہ آئی تھیں۔ اب بعد میں کچھ لوگوں نے" آیت استخلاف" کو جو اول چار خلفاء میں محدود و مقید کرنے کی کوشش کی ہے تو یہ ان کا اپنا خود ساختہ بدعی نظریہ ہے جس کی کوئی سند دور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آیت استخلاف کا مصداق قیامت تک آنے والے مسلمان ہیں جو کہ آیت استخلاف میں موجود شرائط پر پورے اترتے ہوں گے۔ المختصر خلافت" موعودہ" اور" خلافت راشدہ" کی اصطلاحات کی یہ مقید و محدود تشریحات دور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد وضع کی گئیں۔ جبکہ حقیقت میں ہر خلافت،

خلافت راشدہ ہی ہوگی وہ الگ بات ہے کہ کسی خلافت میں رشد کا پہلو زیادہ ہوگا اور کسی میں کم اور آخر میں یہ پہلو کم ہوتے ہوتے اس خلافت کو خلافت کے منصب سے اتار کر دنیاوی حکومت کے منصب پر فائز کر دے گا۔ سو جب ہم خلافت کی بات کرتے ہیں تو قرآن کی اصطلاح میں اس سے مطلب خلافت راشدہ ہی ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں استخلاف فی الارض، وراثت ارضی، تمکن فی الارض اور ملوکیت ایک ہی معنی میں ہیں، جیسا کہ سورۃ الحج میں بیان کیا گیا ہے:

﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ①

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر جب حکومت عطا کرتے ہیں تو صلوٰۃ قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور تمام امور کی انجام دہی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اور جیسا کہ داؤد علیہ السلام وغیرہ کے بارے میں ''ملک'' سے متعلق آیت آتی ہے، یعنی ایک ایسی حکومت جو اللہ کی عدالت کو دنیا میں قائم کرے، ظلم وطغیان سے اس کی زمین کو پاک کرے، اور عام امن وسکون اور راحت وطمانیت کی ضامن ہو۔ قرآن میں اللہ نے کہیں بھی خلافت اور خلافت راشدہ میں تمیز نہیں کی، بلکہ اگر اپنے انبیاء کی حکومتوں کا بھی ذکر کیا ہے تو ان کو صرف خلافت یا ملک ہی فرمایا ہے اور یہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کسی اور انسان کی برپا کردہ خلافت، خلافت راشدہ نہیں ہوسکتی۔ مندرجہ ذیل آیات اس طرف رہنمائی

① سورۃ الحج آیت ۴۱

کرتی ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ ①

اور وہی تو ہے جس نے تم کو خلافت ارضی عنایت فرمائی۔

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ ②

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اسی کو ملوکیت و مملکت فرمایا ہے:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝۲۰﴾ ③

اور ہم نے ان کی بادشاہی کو مستحکم کیا اور ان کو حکمت عطا کی اور (خصومت کی) بات کا فیصلہ (سکھایا)

اسی حکومت کی سلیمان علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ﴾ ④

اے! اللہ مجھے بخش دے ایسی حکومت (ملک) جو کسی دوسرے کے لائق نہ ہو۔

شریعت اسلامیہ کے مطابق امت کا سیاسی نظام بغرض حفظ الدین وسیاست الدنیا جو ایک دنیوی صورت میں کتاب وسنت پر مبنی ہو خلافت راشدہ کہلاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفا میں خلافت کی مختصر الفاظ میں تعریف یوں کرتے ہیں:

---

① سورۃ الانعام: ۱۶۵
② سورۃ ص: ۲۶
③ سورۃ ص: ۲۰
④ سورۃ ص: ۳۵

''خلافت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ریاست عامہ ہوتی ہے جو دینی علوم کے رائج کرنے میں، اسلام کے ارکان قائم رکھنے، جہاد اور اس کے متعلقات برپا کرنے یعنی لشکروں کی تربیت اور مجاہدین کو وظائف دینے اور مال غنیمت تقسیم کرنے میں، قاضیوں کو مقرر کرنے، سزائے جرم کے اجراء اور مظالم کے دور کرنے میں نیز اچھے کاموں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے میں نبی ﷺ کی نیابت کی حیثیت میں ان امور کو انجام دے''۔ ①

سو اس بابت اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ نبی علیہ السلام کے بعد جتنے خلفاء آئے کیا ان کی خلافت میں سورۃ الحج آیت نمبر ۴۱ میں موجود صفات موجود تھیں، یعنی کیا انہوں نے صلوٰۃ کو قائم کیا، زکوٰۃ کا ادارہ مستحکم رکھا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وجوب کا اعادہ کیا، اگر یہ ساری خصوصیات بعد کے خلفاء کی حکومتوں میں پائی جاتی ہیں تو بلا شبہ ان کی خلافت، خلافت راشدہ ہی قرار دی جائے گی۔ البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہر خلافت میں رشد کا پہلو کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں رشد کا پہلو بہت زیادہ تھا جو کہ اس خلافت کو خلافت علی المنہاج النبوۃ تک لے جاتا ہے، یہی کچھ حال سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا۔ البتہ نبی ﷺ کے دور سے زمانی دوری کے سبب رشد کے پہلو میں کچھ کمی واقع ہوئی، لیکن اس قدر زیادہ نہیں، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آتا ہے جو کہ بقول امام مالک بن انس رحمہ اللہ خلافت علی المنہاج النبوۃ کا آخری دور قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوتا ہے جو کہ آپسی خانہ

① جلد ا ص ۳

جنگیوں اور اسلامی علاقوں پر غیر مکمل تسلط کی بناء پر خلافت علی المنہاج النبوۃ کی دہلیز سے اتر کر خلافت راشدہ کے مقام تک آجاتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں ایک خلیفہ راشد کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں، البتہ ان کو وہ موافق سیاسی حالات نہیں مل سکے جو کہ ان کی خلافت کو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا ہم پلہ بنا سکتی لیکن چونکہ ان سب خانہ جنگیوں کے باوجود سورۃ الحج میں بیان کردہ ساری شرائط سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں موجود تھیں، یعنی صلوٰۃ کا قیام، زکوٰۃ کا نظام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت، خلافت راشدہ قرار پائی اور صحابی و عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہ ہونے کی حیثیت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد۔

اس کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور آتا ہے جو کہ خانہ جنگیوں سے پاک اور ایک انتہائی پر امن دور ہوتا ہے، جس میں اسلامی جہاد کا رکا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو جاتا ہے اور پوری مملکت اسلامیہ ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر کفار کے خلاف جہاد کا علم بلند کرتی نظر آتی ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں خلافت راشدہ کے لئے لازم سارے عناصر پائے جاتے ہیں جو کہ صلوٰۃ کے قیام سے لے کر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تک زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں اور بقول شاہ ولی اللہ جس میں جہاد بھی موجود ہے، جس کا سلسلہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپسی خانہ جنگیوں کی وجہ سے موقوف ہو گیا تھا۔ عملاً حکومت کے تمام عہدے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور بقول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امور جہانبانی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ سو صحابی ہونے کی حیثیت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد اور ان کی خلافت، خلافت راشدہ تھی۔ ذاتی فضائل میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ و سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کوئی مقابلہ نہیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ

کا مقام و مرتبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت بڑھ کر تھا لیکن ایک بے لاگ مورخ کی نظروں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے زیادہ مستحکم اور خلافت راشدہ کی شرائط پر اترنے والی تھی۔ اور اس کی سب سے مستند دلیل دور علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ میں موجود جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل ہے کہ وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے توقف کیا اور نہ ہی قصاص عثمان رضی اللہ عنہ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، ان سب نے بخوشی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے برسر اقتدار آتے ہی ان کی خلافت کی بیعت کر لی، جبکہ یہی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خانہ جنگی کے فتنوں سے علیحدہ رہے اور انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ ان اصحاب میں ممتاز نام عشرہ مبشرہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ، زاہد صحابی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، تیس سالہ خلافت والی ضعیف حدیث کے راوی صحابی سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ وغیرہ شامل تھے۔

جناب اسمٰعیل ریحان صاحب کی کتاب" تاریخ امت مسلمہ":

مذکورہ بالا طویل تمہید کے بعد جب ہم جناب اسمٰعیل ریحان صاحب کی کتاب" تاریخ امت مسلمہ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں آں محترم کی کتاب میں جا بجا وہی صدائے بازگشت سنائی پڑتی ہے جس کا مرثیہ و نوحہ درج بالا سطروں میں پڑھا گیا ہے۔ جناب اسمٰعیل ریحان صاحب کی کتاب کے بعض مباحث یقیناً لائقِ تعریف و تحسین ہیں لیکن جیسے ہی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے آخری کے پانچ سال زیرِ بحث آتے ہیں، اُس وقت سے لے کر مشاجرات کے پورے دور تک اسمٰعیل ریحان صاحب وہی موقف پیش کرتے نظر آتے ہیں جو کہ ہمیں سید مودودی کی " خلافت و ملوکیت" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جیسے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ

سے بکراہت صلح کرنا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور سے ملوکیت کا شروع ہونا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا سیدنا حکم بن العاص رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے سیدنا مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ کے بارے میں سخت ناگفتہ بہ خیالات کا اظہار وغیرہ۔ الغرض اس کتاب کی جلد دوم میں آپ کو کئی ایسے مباحث مل جائیں گے جو کہ محتاط لفظوں کے ساتھ ان ہی خیالات کو پیش کرتے ہیں، جن کو" خلافت وملوکیت" میں پیش کرنے پر علمائے دیوبند سید مودودی پر نقد کرتے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس نقد کے ضمن میں مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ نے ایک کتاب" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق" تک لکھ ڈالی تھی جو کہ اپنے موضوع پر ایک مدلل ومحقق تصنیف قرار دی جاتی ہے۔ لیکن حیرت در حیرت ہے کہ جناب اسمٰعیل ریحان صاحب کی اس کتاب کو تائید بھی انہیں مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ سے ملی۔ اہل علم کے مابین مفتی صاحب کی جو حیثیت مسلّم ہے اس کے تحت ان کی جناب میں کسی سوءِ ظنی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اس متعلق ہمارا حسنِ ظن یہی ہے کہ غالباً مفتی صاحب نے پوری کتاب پڑھے بنا محض اس کے سرسری مطالعہ کے بعد کتاب پر تائیدی تبصرہ کیا ہوگا۔ اور اگر واقعی مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ نے " تاریخ امت مسلمہ" کے مندرجات کی تائید کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد کی ہے تو پھر یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ مفتی صاحب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ومشاجرات سے متعلق اپنے گزشتہ موقف سے رجوع کر چکے ہیں جس کا اظہار انہوں نے بدلائل اپنی کتاب" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق" میں کیا تھا۔ کیونکہ اگر اس مفروضہ کو مان کر نہ چلیں تو پھر لامحالہ مفتی صاحب پر دوہرے معیار کی تہمت عائد ہوگی کہ جن باتوں کے لیے مفتی صاحب نے سید مودودی جیسے اہل علم پر تنقید کی، جب اسی طور کی تحقیقات ان کے اپنے مسلک کے عالم کی طرف سے پیش

کی گئیں تو نقد کجا مفتی صاحب نے اس کی تائید فرمادی۔ کم از کم ہمارا دل تو مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ کی بابت یہ سوءظن کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوتا اور اس سلسلے میں ہم پہلے دونوں بیان کردہ مواقف کو ماننے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔

جناب اسمٰعیل ریحان صاحب کی کتاب علمی و محققانہ طور پر کافی کچھ کمزوریوں کا شکار نظر آتی ہے، خاص کر مشاجراتِ صحابہ کے موضوع سے متعلق وہ انصاف کے تقاضوں پر بالکل نہ اتر سکے۔ اس سلسلے میں کئی ایک اہل علم کی جانب سے تشویش کا اظہار کیا گیا تاہم عملی طور پر اس سلسلے میں سب سے اول جس شخصیت نے قلم اٹھایا وہ جناب حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ ہیں جنہوں نے فیس بک پر اقساط کی صورت میں اس کتاب کے بعض مباحث پر ناقدانہ تجزیہ پیش کیا۔ حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ کی تحریر کردہ انہیں اقساط کو" حارث پبلی کیشنز" کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ پوری کتاب پر نقد نہیں بلکہ کتاب کے صرف چند مندرجات پر نقد ہے اور اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ مولف کا ارادہ ہے کہ وہ کتاب کے کمزور و غیر محقق مندرجات کے تنقیدی تجزیئے کا سلسلہ جاری رکھیں گے جس کو ان شاء اللہ بعد میں دیگر جلدوں کے ضمن میں ادارہ سے شائع کیا جاتا رہے گا۔

حافظ عبید اللہ حفظہ اللہ نے سن ۱۹۸۹ء میں وفاق المدارس العربیۃ پاکستان سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ کچھ عرصہ اسلام آباد کی ایک اسلامی جامعہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور پھر معاش کے سلسلے میں ابوظہبی متحدہ عرب امارات منتقل ہو گئے، جہاں سترہ سال تک آپ بطور ہیومن ریسورس کوآرڈینیٹر مختلف حکومتی اداروں میں کام کرتے رہے۔ آپ کی اب تک تین عدد علمی و وقیع کتب شائع ہو کر علمی حلقوں سے داد و تحسین

حاصل کر چکی ہیں جن میں " مطالعہ قادیانیت"، " احادیث نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اور منکرینِ حدیث کے اعتراضات کا علمی و تحقیقی جائزہ" اور" تعارف حضرت مہدی علیہ الرضوان اور مرزا قادیانی کے دعوائے مہدیت کی حقیقت" شامل ہیں جبکہ حارث پبلی کیشنز سے آپ کی ایک کتاب" مولانا طاہر حسین گیاوی (انڈیا) کی کتاب شہید کربلا اور کردارِ یزید کا علمی و تحقیقی جائزہ" جدید طباعت کے ساتھ جبکہ دوسری کتاب" جدید سبائی گروہ کا علمی تعاقب" بصورت پی ڈی ایف شائع کی جا چکی ہے۔ تاریخ آپ کا خاص میدان ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس سلسلے میں اب استناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق نہایت نپی تلی اور محتاط گفتگو کرنے کے قائل ہیں اور اسی ضمن میں آپ کے اکثر مضامین فیس بک پر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ حارث پبلی کیشنز کے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ آپ کی تحقیق ادارے سے شائع ہو کر قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں سب سے اول اس اللہ عزوجل کے حضور شکر گزار ہوں کہ اس مالک نے اس احقر کو اس قابل بنایا کہ وہ یہ کام کر سکے۔ اگر اس کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی کے کرم سے یہ کام ہو سکا ہے اور اس کام کی ہر اچھائی صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے سبب سے ہے۔ اس مالک کُل کے شکریہ کے بعد اپنے عزیز دوست محترم راشد جمال، محمد صہیب نذیر اور بلال احمد راؤ کا شکریہ ادا کروں گا کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ناممکن تھا۔ ان کی ہمت اور ساتھ رہا کہ یہ کام ہو سکا۔ اللہ اس دوستی اور ساتھ کو ہمیشہ بنائے رکھے۔ ساتھ ہم محترم جناب حافظ عمران حفظہ اللہ کے نہایت ممنون ہیں کہ انہوں نے نہایت دقتِ نظری سے تحریری مواد کی فارمیٹنگ کر کے نہایت کم وقت

میں جدید کمپیوٹرائز کمپوزنگ کے قالب میں ڈھالا۔ اس کے لئے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

کسی بھی کام میں کمال صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو ہی سزاوار ہے، مخلوق کا کام تو غلطیوں سے پُر ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی غلطی کوئی کمی نہ رہ جائے، تاہم اس کے باوجود اگر کوئی کمی یا غلطی رہ جائے تو قارئین سے التماس ہے کہ اس بابت مطلع فرمائیں، ان شاء اللہ ایجابی طریق سے آئی ہر تنقید کو سر آنکھوں پر رکھا جائے گا۔

محمد فہد حارث

دبئی، متحدہ عرب امارات

۱۸ جولائی ۲۰۲۰ء بمطابق ۲۷ ذوالقعدۃ ۱۴۴۱ھ

چند گذارشات

جناب اسماعیل ریحان صاحب کے بیان کردہ اصولوں پر

جناب اسماعیل ریحان صاحب نے اپنی کتاب کے شروع میں تاریخ نویسی کے کچھ اصول بیان کیے ہیں، آیئے پہلے مختصر طور پر ان میں سے چند اہم باتوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تاکہ ہم آگے جو بیان کرنے جا رہے ہیں اسے انہی اصولوں کی بنیاد پر رکھا جا سکے۔

انہوں نے" تاریخ نویسی کے انداز" کے عنوان کے تحت، تاریخ نویسی کے تین انداز بیان کیے ہیں:

نمبر ا: تاریخ بالروایۃ:

اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اس انداز میں روایات کو من وعن نقل کر دیا جاتا ہے، مؤرخ اپنی طرف سے کوئی تشریح یا تبصرہ نہیں کرتا..... سند اور واقعے کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جاتا ہے، تاریخ نویسی کے اس انداز کی امثلہ میں اسماعیل ریحان صاحب نے طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، انساب الاشراف اور فتوح البلدان کا نام لکھا ہے، اور پھر لکھا ہے کہ تاریخ نویسی کے اس انداز کا کمزور پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس میں بسا اوقات خلاف عقل اور بعید از قیاس باتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں، اگر پڑھنے والا فطرت سلیمہ کا مالک نہ ہو، اصول روایت و درایت پر اس کی نظر نہ اور وہ صحیح و سقیم کی تمیز نہ کر سکے تو اس کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اسی لیے علمائے کرام ایسی بڑی تاریخی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے ہیں کیوں کہ وہ

اہل فن کے لیے ہیں نہ کہ عوام کے لیے.... تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد جیسی کتب کا ترجمہ پڑھ کر عام انسان سخت لغزشوں کا شکار ہوسکتا ہے۔

نمبر ۲: تاریخ بالدرایۃ:

تاریخ نویسی کے اس انداز کی وضاحت اسماعیل ریحان صاحب نے یوں کی ہے کہ اس میں مؤرخ چند روایات یا قرائن لے کر کسی واقعے کی کڑیاں ملاتا جاتا ہے، آثار قدیمہ اور دوسرے شواہد اور کچھ قیاسات سے ایک تاریخ مرتب کر دیتا ہے.....اس انداز کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس طرح مرتب کی گئی تاریخ کی کوئی پختہ بنیاد نہیں ہوتی، سارا کمال مؤرخ کے اپنے اندازے اور تخمینے کا ہوتا ہے وہ اپنے انداز سے جس روایت کو چاہے لیتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ دیتا ہے..... چونکہ انسان تعصب اور جانب داری سے بہت کم خالی ہوتا ہے اس لئے" درایت" کا استعمال انصاف کے ساتھ بہت کم ہوتا ہے، عموماً درایت کے نام پر اپنے ذوق، رجحان اور جذبات کے مطابق پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

نمبر ۳: تاریخ بالروایۃ والدرایۃ:

تاریخ نویسی کے اس تیسرے انداز کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں روایات اور عقلی امکانات دونوں کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے، اصل مدار تاریخی روایات پر رکھا جاتا ہے مگر گری پڑی باتوں کو جمع نہیں کیا جاتا جہاں کوئی مشکوک روایت نقل کرنی ہو وہاں قارئین کو متنبہ کر دیا جاتا ہے، بقول اسماعیل ریحان صاحب، یہ تاریخ نویسی کا بہترین انداز ہے۔ ①

---

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ا صفحات ۶۳ ۔ ۶۴.

جناب اسماعیل ریحان صاحب نے تاریخ نویسی کا کون سا انداز اپنایا؟

اسماعیل ریحان صاحب کی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری منصفانہ اور غیر جانبدارنہ رائے یہ ہے کہ انہوں نے یہ کتاب" تاریخ نویسی کے دوسرے انداز" کے مطابق لکھی ہے، جس انداز میں خود ان کے بقول:

" سارا کمال مؤرخ کے اپنے اندازے اور تخمینے کا ہوتا ہے اور وہ اپنے اندازے سے جس روایت کو چاہے لیتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ دیتا ہے اور چونکہ انسان تعصب اور جانب داری سے بہت کم خالی ہوتا ہے اس لئے درایت کا استعمال انصاف کے ساتھ بہت کم ہوتا ہے اور عموماً درایت کے نام پر اپنے ذوق، رجحان اور جذبات کے مطابق پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی ہے"۔

اسماعیل ریحان صاحب نے سو فیصد اسی انداز سے یہ" جدید تاریخ" مرتب کی ہے۔(اس کی چند مثالیں ہم آگے ذکر کریں گے)۔

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے " تاریخ نویسی کے چند اہم اصول" کا عنوان قائم کیا ہے اور پھر" مؤرخ کی صفات"، " تاریخی روایات نقل کرنے کی شرائط" اور" سوانح نگاری کے لیے شرائط" جیسے ذیلی عناوین قائم کر کے بہت سے نکات لکھے ہیں، ہم ان میں سے چند چیدہ چیدہ اہم نکات کا خلاصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔مؤرخ کو آداب تحریر وتقریر سے واقف ہونا چاہیے۔

۲۔تعصب، جھوٹ، فریب اور مبالغہ آمیزی سے پاک ہونا چاہیے۔

۳۔تاریخی روایات نقل کرتے وقت، مؤرخ کے لیے شرط ہے کہ وہ راوی کے اصل الفاظ نقل کر رہا ہو، اپنے الفاظ میں مفہوم بیان نہ کر رہا ہو، نیز راوی کا نام وضاحت کے ساتھ بیان کر رہا ہو۔

۴۔واقعے کی تعبیر میں اعتدال اور غیر جانبدرانہ انداز اپنایا گیا ہو۔

۵۔سوانح نگاری میں جس کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں تعریفی یا مذمتی الفاظ اور القاب وآداب کے استعمال میں اعتدال سے کام لیا جائے۔

۶۔سوانح نگار کا معتدل مزاج ہونا ضروری ہے، یعنی وہ کسی کی محبت کی وجہ سے اس کی تعریف یا کسی سے نفرت کے باعث اس کی مذمت کرنے میں جذبات سے مغلوب ہونے والا نہ ہو۔مؤرخ کی نہ تو اس سے ایسی دوستی ہو جس کے سبب وہ اس کے لیے جانب داری سے کام لے، نہ ایسی مخالفت ہو جس کے باعث وہ اس کی قدر گھٹا دے۔ ①

تبصرہ:

اسماعیل ریحان صاحب کی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ بالا شرائط کا بھی کما حقہ لحاظ نہیں کیا، بلکہ بے اعتدالی، جانبداری اور بے انصافی سے کام لیا ہے خاص طور پر کچھ شخصیات کے بارے میں بات کرتے ہوئے انہوں نے ایسی روایات پیش کر دی ہیں جو اصول روایت کی رو سے صحیح نہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب بھی سوانح نگاری

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ا صفحات ۶۵۔۶۶.

میں تعریف اور مذمت کرنے میں جذبات سے مغلوب ہیں (اس کی بھی چند مثالیں آگے بیان ہوں گی)۔

اسلامی تاریخ میں اسناد کی اہمیت:

جناب اسماعیل ریحان صاحب" اسلامی تاریخ اور دیگر تواریخ کے درمیان فرق" بیان کرتے ہوئے، پہلا فرق یوں بیان کرتے ہیں:

" اسلامی تاریخ میں اسناد کو اہم حیثیت حاصل ہے، دوسری تاریخوں میں اسناد کا کوئی حصہ نہیں، روایات کو ماننے یا مسترد کرنے کا کوئی اصول نہیں، بعض شخصیات سے اندھی عقیدت اور بعض سے بے جا نفرت کارفرما نظر آتی ہے"۔ ①

لیکن افسوس یہ ہے کہ خود اسماعیل ریحان صاحب بھی" اسلامی تاریخ" لکھتے وقت اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور بعض شخصیات کی عقیدت اور بعض دوسری شخصیات کی نفرت میں پیش کردہ کئی ضعیف اور منقطع روایات کو" متصل الاسناد"، "حسن" اور" قابل قبول" ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)۔

''کیا ایک روایت (یا واقعہ) کو متعدد مصنّفین کا نقل کر دینا اس کے معتبر ہونے کی دلیل ہے؟''

اس عنوان کے تحت، ایک جگہ اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اگر ایک واقعہ شروع میں ایک ضعیف گواہ نے بیان کیا ہو، پھر اس سے تین افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۴۸.

عالم فاضل لوگوں نے اسے نقل کر دیا تو اس طرح ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے جانے سے اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی، اگر شروع کے راوی ضعیف ہیں تو واقعہ ضعیف ہی ثابت ہوگا، اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص نے قتل کی واردات ہوتے دیکھی اور کہا کہ یہ فلاں وزیر صاحب کی کارستانی ہے، اس بات کو دس افراد نے سنا، ان دس افراد سے سن کر پچاس مبصرین نے اس موضوع پر مذمتی تقریریں کر ڈالیں، تو اس سے وزیر صاحب کا مجرم ہونا یقینی نہیں ہوگیا، ایک عام آدمی کے نزدیک چاہے یہ بات یقینی ہو مگر علمی میزان میں یہ چیز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی، اگر کسی عدالت میں یہ قضیہ پیش کیا گیا تو وزیر صاحب کے خلاف ان دس افراد اور پچاس مبصرین سے گواہی نہیں دلائی جاسکتی، گواہی کے لیے صرف وہ پہلا چشم دید گواہ طلب کیا جائے گا، اگر وہ معتبر ہے اور اپنے بیان کا کوئی ثبوت پیش کرسکتا ہے تو وزیر صاحب کو مجرم مانا جائے گا ورنہ نہیں، جعلی روایات میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ناقابل اعتماد راوی سے منقول ہوتا ہے، وہ راوی اسے خود گھڑ لیتا ہے یا اصل بات کو مبالغے کے ساتھ سناتا ہے، اس طرح وہ آگے کئی ناقلین پیدا کر لیتا ہے، ان ناقلین سے بہت سے مؤرخین روایت لے لیتے ہیں کیونکہ اس واقعے میں جو تفصیلات ہوتی ہیں وہ انہیں کہیں اور دستیاب نہیں ہوتیں، آہستہ آہستہ اس بات کو تاریخی حقیقت کا درجہ دے دیا جاتا ہے، جبکہ اس کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے"۔ ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۶۔۵۷.

تبصرہ:

معلوم ہوا کہ کسی روایت یا واقعہ کی بنیاد اگر کسی ضعیف یا جھوٹے یا نا قابل اعتبار راوی پر ہو، یا اس کی سند ہی منقطع ہو، تو ایسی روایت یا واقعہ کو چاہے سینکڑوں لوگوں نے آگے نقل کر دیا ہو تو یہ نقل کرنا اس روایت یا واقعہ کو" مستند" اور" صحیح" ثابت نہیں کر سکتا، اور یہ بات علمی میزان میں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔

لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے اپنے بیان کردہ اس اصول کی بھی پاسداری نہیں کی اور جا بجا ایک ضعیف یا غیر مستند روایت یا واقعہ کے بارے میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس بنیاد پر اسے قابل قبول قرار دیا ہے کہ" اسے کئی لوگوں نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے اس لئے یہ بلا شبہ قابل قبول ہے" (مثالیں آگے بیان ہوں گی)۔

کسی راوی کی" ثقاہت" یا" ضعف" کیسے ثابت ہوگا؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ:

"...ثقاہت یا ضعف کا فیصلہ کسی ایک آدھ نقاد کی رائے سے نہیں ہوگا، بلکہ جمہور کی ان آراء سے ہوگا جنہیں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ جیسے حضرات نے مرتب کیا ہے"۔ ①

تبصرہ:

اگرچہ فن اسماء الرجال وجرح وتعدیل میں اصول یہ ہے کہ" جرح مفسر" بہر صورت" تعدیل" پر مقدم ہوتی ہے، اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس راوی کی تعدیل کرنے والے زیادہ ہیں یا کم ہیں، لیکن چونکہ اسماعیل ریحان

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۳۴.

صاحب نے یہ اصول لکھا ہے، اس لیے انہوں نے اپنی کتاب" تاریخ امت مسلمہ" میں چند راویوں کی توثیق وتضعیف کے بارے میں جو انداز اپنایا ہے ہم ان کے طریقہ کو انہی کے اصول کی روشنی میں پرکھیں گے اور بتائیں گے کہ جہاں انہوں نے اپنا کوئی خاص مفروضہ کسی ایسی روایت سے ثابت کرنا ہوتا ہے جس کا کوئی راوی" جمہور ائمہ" کے نزدیک ضعیف ہوتا ہے، تو وہ کیسے کچھ اس طرح سے اسے قابل قول بناتے ہیں کہ" اگرچہ زیادہ تر ائمہ نے اس کی تضعیف کی ہے، لیکن فلاں امام نے چونکہ اسے ثقہ کہا ہے اس لیے یہ قابل قبول ہے" (یا اس طرح کے الفاظ لکھتے ہیں، تفاصیل آگے بیان ہوں گی)۔

نوٹ: ہمارے زیر مطالعہ" تاریخ امت مسلمہ" کا" دوسرا ایڈیشن" ہے لہٰذا تمام حوالہ جات اسی ایڈیشن کے مطابق ہیں۔

اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کی چند جھلکیاں

آیئے اب اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کی چند جھلکیاں دیکھتے ہیں۔

جناب اسماعیل ریحان صاحب نے واقعہ حرہ میں مدینہ کے کچھ لوگوں کی طرف سے حکومت وقت کے خلاف خروج کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ طبری کی ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ مدینہ پر حملے کے لیے یزید بن معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے کئی امراء تیار نہ ہوئے اور انہوں نے لشکر کشی سے صاف انکار کر دیا، پھر لکھتے ہیں:

> " آخر عبید اللہ بن زیاد کو یہ کام سونپنے کی کوشش کی گئی مگر وہ سانحۂ کربلا کی وجہ سے اپنی رسوائی کا ذمہ دار یزید کو سمجھتا تھا جس کی خوشنودی کے لئے اس نے یہ مظالم ڈھائے تھے، چنانچہ اب وہ یزید کی خاطر مزید بدنامی مول لینے کی ہمت نہ کر سکا اور صاف جواب دیتے ہوئے کہا: اس فاسق (یزید) کے لئے میں یہ دونوں کام کبھی جمع نہیں ہونے دوں گا کہ رسول اللہ ﷺ کے نواسے کا قتل بھی میرے ذمہ ہو اور بیت اللہ پر حملہ بھی"۔ ①

نوٹ: جناب اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کی داد دیجئے کہ وہ بتا یہ رہے ہیں کہ" یزید نے مدینہ منورہ پر حملے" کی مہم عبید اللہ بن زیاد کو سونپنے کی

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۴.

کوشش کی تو اس نے یہ جواب دیا۔۔اس کے جواب میں" بیت اللہ" پر حملے کا ذکر ہے، نہ کہ" مدینہ" پر، اور یہاں حاشیہ میں اسماعیل ریحان صاحب نے اس بات کے لیے حوالہ دیا ہے تاریخ طبری کا، جب ہم تاریخ طبری میں یہ روایت دیکھتے ہیں کہ وہاں اس روایت میں مدینہ پر حملہ کا نہیں بلکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لشکر کشی کا ذکر ہے (کتب یَزِید إِلَی ابن مرجانة: أن اغز ابن الزُبَیر)، یعنی یہ روایت (قطع نظر اس کی اسنادی حیثیت کے) واقعہ حرہ سے متعلق ہی نہیں۔

بہر حال اسماعیل ریحان صاحب نے تاریخ طبری سے اس روایت کی سند یوں نقل کی ہے:"رواه الطبري عن ابن حميد عن جَرير عن مغيرة" اور اس روایت کی سند کو" حسن" بتایا ہے، پھر ان راویوں کا تعارف کرواتے ہوئے پہلے راوی مؤرخ طبری کے استاد "محمد بن حمید رازی" کے بارے میں بڑے مبہم انداز میں نرمی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" محمد بن حمید الرازی (م ۲۴۸ھ) امام ابوداود، امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل کے شیخ ہیں، اگرچہ انہیں ضعیف کہا گیا ہے مگر امام احمد ان کی توثیق کرتے تھے، حافظ ذہبی کے بقول سند میں گڑبڑ کرتے تھے مگر ان پر متن گھڑنے کا شک نہیں کیا جا سکتا"۔ ①

غور فرمائیں! اسماعیل ریحان صاحب کا یہ اصول ہم پہلے نقل کر آئے ہیں کہ:

"...ثقاہت یا ضعف کا فیصلہ کسی ایک آدھ نقاد کی رائے سے نہیں ہوگا، بلکہ جمہور کی ان آراء سے ہوگا جنہیں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۴ حاشیہ۔

جیسے حضرات نے مرتب کیا ہے"۔ ①

لیکن یہاں مؤرخ صاحب اپنی "غیر جانبداری"، "انصاف پسندی" اور "اصول روایت" کا بھرم خود توڑ رہے ہیں، اب آئیں ملاحظہ فرمائیں، اس "محمد بن حمید رازی" کے بارے میں جمہور ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال:

امام ابوحاتم رازی نے "محمد بن حمید الرازی" کے بارے میں فرمایا "کذاب لا یحسن یکذب" ایسا جھوٹا جو جھوٹ بھی اچھے طریقے سے نہیں بول سکتا (اور ابوحاتم رازی نے جس وجہ سے یہ بات فرمائی وہ بھی تفصیل کے ساتھ یہاں مذکور ہے، لہٰذا یہ جرح مفسر ہے) ②

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: "فیه نظر" اس میں نظر ہے۔ ③

امام ابوزرعۃ رحمہ اللہ نے بھی اس کے جھوٹے ہونے کا بتایا۔ ④

ابن خراش رحمہ اللہ نے کہا: "اللہ کی قسم یہ جھوٹا ہے" ⑤

امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا "لیس بشيء" یہ کچھ بھی نہیں ⑥

امام نسائی نے ہی کہا "لیس بثقة" یہ ثقہ نہیں ہے۔ ⑦

فضلک رازی کہتے ہیں:

"دخلت علی محمد بن حمید وهو یرکب الأسانید علی

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۳۴۔

② الضعفاء لابي زرعة الرازي، جلد ۲، صفحه ۷۳۹، طبع المدينة المنورة .

③ التاریخ الکبیر، جلد ۱، صفحہ ۶۹، طبع انڈیا۔

④ تهذیب التهذیب، جلد ۹، صفحہ ۱۳، طبع دائرۃ المعارف، انڈیا۔

⑤ حوالہ مذکورہ۔

⑥ حوالہ مذکورہ۔

⑦ میزان الاعتدال، جلد ۳، صفحه ۵۳۰ دار المعرفة بیروت .

المتون" میں محمد بن حمید کے پاس گیا تو یہ متون کی سندیں وضع کر رہا تھا" (یعنی جھوٹی سندیں بنا رہا تھا)۔①

یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں:

"کثیر المناکیر" یہ بہت زیادہ منکر روایات بیان کرتا ہے۔②

صالح بن جزرۃ نے کہا:

"ما رأيت أحذق بالكذب من ابن حميد ومن ابن الشاذكوني" میں نے دو آدمیوں سے زیادہ جھوٹ کا ماہر کوئی نہیں دیکھا، ایک محمد بن حمید اور دوسرا ابن شاذکونی۔③

امام ذہبی نے لکھا:

"محمد بن حميد الرازي – مُتَّهم" ، یہ وضع حدیث سے متہم ہے۔④

امام سیوطی نے بھی اسے "کذاب" (بڑا جھوٹا) کہا ہے۔⑤

حافظ ابن کثیر اسی "ابن حمید" کی ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ حُمَيْدٍ الرَّازِيُّ - وَهُوَ شِيعِيٌّ" (محمد بن حمید رازی نے کہا جو کہ شیعہ ہے)⑥

لیکن اسماعیل ریحان صاحب "جمہور ائمہ" کے ان تمام اقوال کے بعد بھی بڑے بھولے انداز میں لکھتے ہیں کہ:

①②③میزان الاعتدال، جلد۳، صفحہ ۵۳۰ دار المعرفۃ بیروت .
④تلخيص الموضوعات لابن الجوزي، صفحہ ۳۴۹، مكتبة الرشد، الرياض .
⑤اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة، جلد ۱، صفحہ ۱۲، دار الكتب العلمية بيروت .
⑥البداية والنهاية، جلد ۸، صفحہ ۲۰۹، طبع دار احياء التراث العربي .

"اگرچہ انہیں ضعیف کہا گیا ہے مگر امام احمد ان کی توثیق کرتے تھے، حافظ ذہبی کے بقول سند میں گڑبڑ کرتے تھے مگر ان پر متن گھڑنے کا شک نہیں کیا جا سکتا"۔

یعنی جو شخص سندیں گھڑا کرتا تھا (یرکب الأسانید علی المتون) اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ صرف سند ہی تو گھڑا کرتا تھا، اس پر متن گھڑنے کا شک نہیں ہو سکتا، جبکہ اس راوی پر "کذاب" ہونے کی شدید ترین جرح بھی پائی جاتی ہے جسے اسماعیل ریحان صاحب نہ جانے کس کھاتے میں ڈالیں گے؟۔

پھر یہ روایت بیان کرنے والے ہیں "مغیرة بن مقسم" جن کی وفات خود اسماعیل ریحان صاحب نے سنہ ۱۳۶ ہجری لکھی ہے، ان کی تو کبار تابعین سے بھی ملاقات ثابت نہیں اور ہمارا دعوی ہے کہ انہوں نے واقعہ حرہ کا زمانہ بھی نہیں پایا، اور نہ ہی انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ بات انہیں کس نے بتائی، نیز یہ "مغیرہ بن مقسم" تیسرے درجہ کے مدلس بھی ہیں۔ ① اور یہاں وہ سماع کی تصریح تو کیا اپنے استاد کا نام بھی ذکر نہیں کر رہے، تو پھر کس طرح "محمد بن حمید" رازی جیسے کذاب اور شیعی راوی کے ہوتے ہوئے نیز مغیرہ بن مقسم کے زمانہ حرہ کے وقت موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہ ہوتے ہوئے اسماعیل ریحان صاحب اس روایت کی سند کو "باسناد حسن" لکھ رہے ہیں؟؟ کیا یہی ہے ان کا وہ اصول کہ:

"سوانح نگار کا معتدل مزاج ہونا ضروری ہے، یعنی وہ کسی کی محبت کی وجہ سے اس کی تعریف یا کسی سے نفرت کے باعث اس کی مذمت کرنے میں جذبات سے مغلوب ہونے والا نہ ہو۔ مؤرخ کی نہ تو اس

① دیکھیں: طبقات المدلسین لابن حجر، صفحہ ۴۶، طبع مکتبۃ المنار عمان۔

سے ایسی دوستی ہو جس کے سبب وہ اس کے لیے جانب داری سے کام لے، نہ ایسی مخالفت ہو جس کے باعث وہ اس کی قدر گھٹا دے"۔

اور

" اسلامی تاریخ میں اسناد کو اہم حیثیت حاصل ہے، دوسری تاریخوں میں اسناد کا کوئی حصہ نہیں، روایات کو ماننے یا مسترد کرنے کا کوئی اصول نہیں، بعض شخصیات سے اندھی عقیدت اور بعض سے بے جا نفرت کارفرما نظر آتی ہے" ؟؟

اسی واقعہ حرہ کے بیان میں اسماعیل ریحان صاحب نے یہ بات بیان کی ہے کہ یزید نے مسلم بن عقبہ کو یہ مہم سونپی اور اسے تاکید کی کہ:

" تین دن تک اہل مدینہ کو (جو خروج کے مرتکب ہوئے تھے۔ناقل) اطاعت کی دعوت دینا، پھر بھی وہ نہ مانیں تو لڑنا، اگر تم غالب آجاؤ تو تین دن تک شہر کو لوٹنا، روپیہ پیسہ، عام استعمال کی اشیاء، اسلحہ اور سامان خورد و نوش فوج کا ہوگا، علی بن حسین (زین العابدین رحمہ اللہ) کا خیال رکھنا، ان کا اس بغاوت سے کوئی تعلق نہیں"۔ ①

یہاں حاشیہ میں اسماعیل ریحان صاحب نے بڑی" مہارت" دکھائی ہے صرف "انساب الاشراف للبلاذري" اور "تاريخ الاسلام للذهبي" کا حوالہ دیا ہے، جب کہ ان دونوں کتابوں میں اس بات کی سرے سے کوئی سند ہی موجود نہیں، اور اس روایت کی سند جس کتاب میں موجود ہے اس کا نام اسماعیل ریحان صاحب نے عمداً نہیں لکھا، اور وہ ہے" تاریخ طبری"، جانتے ہیں اس کا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۴.

نام کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ وہ سند ہے جس کے ساتھ مؤرخ طبری نے یہ بات نقل کی ہے، غور سے پڑھیں:

"ذكر هِشَام بن مُحَمَّدٍ، عن أبي مخنف، عن عبد الملك بن نوفل بن مساحق، عن حبيب بن كرة....." ①

قارئین محترم! آپ کو اس سند میں "ابومخنف" کا نام تو نظر آ رہا ہوگا اور اسے آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے، نیز ابومخنف سے روایت کرنے والے صاحب ہیں "ہشام بن محمد"، یہ "ہشام بن محمد کلبی" ہیں، ان کا مختصر حال بھی یہ ہے کہ یہ "رافضی"، "متروک" اور "ناقابل اعتماد" ہیں۔ ②

لیکن اسماعیل ریحان صاحب کی "انصاف پسندی"، "غیر جانبداری" اور "اصول روایت" کی پاسداری پر داد دیجئے کہ وہ ابومخنف اور ہشام کلبی جیسے راویوں کی اس روایت کو یوں "قابل قبول" بنانے کے چکر میں ہیں کہ:

"یہ روایت ضعیف سند سے مروی ہے (جناب! آپ نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں تو سرے سے کوئی سند ہی نہیں، آپ نے تو اس کتاب کا حوالہ ہی نہیں دیا جس میں یہ سند موجود ہے۔ ناقل) مگر محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل کا اتفاق ہے کہ یزید نے یہ حکم دیا تھا، اس لیے یہاں یزید کی طرف منسوب یہ الفاظ نقل کر دیے گئے"۔ ③

قارئین محترم! اسماعیل ریحان صاحب کا لکھا ہوا یہ اصول ہم نقل کر آئے

---

① تاریخ طبری، جلد ۵، صفحہ ۴۸۴، دار التراث، بیروت۔

② دیکھیں: میزان الاعتدال، جلد ۴، صفحہ ۳۰۴ دار المعرفة بيروت / لسان الميزان بتحقيق شيخ ابي غدة، جلد ۸، صفحہ ۳۳۸ دار البشائر الاسلامية۔

③ تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۴ حاشیہ نمبر ۳

ہیں کہ:

"اگر ایک واقعہ شروع میں ایک ضعیف گواہ نے بیان کیا ہو، پھر اس سے تین افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں عالم فاضل لوگوں نے اسے نقل کر دیا تو اس طرح ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے جانے سے اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی، اگر شروع کے راوی ضعیف ہیں تو واقعہ ضعیف ہی ثابت ہوگا.....الخ"۔ ①

اب یہاں دیکھیں کس طرح اس اصول کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں، ابومخنف اور ہشام کلبی جیسے لوگوں کی روایت، جسے خود اسماعیل ریحان صاحب "ضعیف سند والی" تسلیم بھی کر رہے ہیں، اور اس میں مدینہ میں لوٹ مار کرنے کے حکم کا ذکر بھی کر رہے ہیں (جبکہ اس جھوٹی روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا ترجمہ "لوٹ مار کرنا" ہو) اور اس غیر مستند بات کو مستند یوں قرار دے رہے ہیں کہ "محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے کا کہنا ہے کہ یزید نے ایسا ہی حکم دیا تھا، اس لیے میں نے یہ الفاظ نقل کر دیے"....کیا "انصاف"، "غیر جانبداری" اور "اصول روایت" اسی کا نام ہے؟؟

اور پھر اگر "حکم دینے" سے مراد یہ ہے کہ یزید نے (جو کہ حاکم وقت تھا اور اس کی حکومت قائم ہو چکی تھی، خود اسماعیل ریحان صاحب کا اقرار ہے کہ: اکثریت نے یزید کی ولی عہدی اور خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۴۱) تو ظاہر ہے حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں یا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۶۔۵۷.

بغاوت کرنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی کا حکم حاکم نے ہی دینا ہوتا ہے، لیکن اگر اسماعیل ریحان صاحب کا یہ دعوی ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ جو انہوں نے "ابومخنف و ہشام کلبی" والی روایات کے حوالے سے نقل کیے ہیں، یزید کی طرف سے حکم دینے پر محدثین وائمہ جرح وتعدیل کا اتفاق ہے تو یہ بات ثابت کرنا ان پر لازم ہے، ہمارے نزدیک اگر اسماعیل ریحان صاحب یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اس جھوٹی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی صحت پر محدثین و ائمہ جرح و تعدیل کا اتفاق ہے تو یہ سراسر ایک غلط بیانی ہے۔

اسی طرح اسی واقعہ حرہ کے بیان میں اسماعیل ریحان صاحب نے مختلف کتب کے حوالے سے" امام مالک بن انس رحمہ اللہ" کی طرف منسوب ایک روایت بھی نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

" حرہ کے مقتولین سات سو افراد تھے جو قرآن مجید کے حافظ و قاری تھے"۔

اور اسماعیل ریحان صاحب نے اس روایت کو" عمدہ روایت" لکھا نیز حاشیہ میں لکھا کہ" روایت کی سند صحیح اور متصل ہے"۔ ①

لیکن یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی اور واقعہ حرہ کس سنہ میں ہوا؟؟ اگر وہ یہ بتا دیتے تو پھر اس کی سند کو" عمدہ" اور" متصل" نہ لکھ سکتے۔ آیئے ہم بتاتے ہیں، واقعہ حرہ سنہ ۶۳ ہجری میں ہوا اور امام مالک بن انس رحمہ اللہ اس واقعہ کے تقریباً ۳۰ سال بعد سنہ ۹۳ ہجری میں پیدا ہوئے، یوں یہ بات تو یقینی ہے کہ اس روایت

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۶ مع حاشیہ نمبر ۳.

میں بیان کی گئی بات امام مالک رحمہ اللہ نے کسی اور سے سنی ہوگی، اور اس راوی کا اس روایت کی سند میں کہیں کوئی ذکر نہیں، تو پھر یہ سند "متصل صحیح" کیسے ہوئی؟؟ ہاں اگر "متصل" سے مراد امام مالک رحمہ اللہ تک متصل ہے تو وہ الگ بات ہے، لیکن جس واقعہ کا اس میں بیان ہے اس تک یہ سند "منقطع" ہے اور ہرگز "متصل" نہیں، لیکن چونکہ یہاں "مؤرخ اسلام" صاحب کے "غیر جانبداری" اور "انصاف پسندی" کچھ دیر کے لیے شاید ان کے اندر کے جذبات سے مغلوب ہو کر سو گئی تھی اس لیے یہ بات ان سے اوجھل رہ گئی کہ امام مالک رحمہ اللہ نے حرہ کا زمانہ نہیں پایا۔ واضح رہے کہ اس وقت ہمارے زیر بحث واقعہ حرہ کی تفصیل یا یزید بن معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی ذات نہیں، ہم صرف اسماعیل ریحان صاحب کی "انصاف پسندی" اور "غیر جانبداری" اور تمام روایات کی "اصول روایت" کے مطابق جانچ پھٹک پر بات کر رہے ہیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور آپ کو شہید کرنے والوں کے بارے میں

اسماعیل ریحان صاحب کا "نرم" موقف اور نادر تحقیق

جناب اسماعیل ریحان صاحب، ایک طرف تو صحابہ کرام کے ایک فریق (جن میں اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ، حضرات طلحہ وزبیر ومعاویہ وعمرو بن العاص ومغیرۃ بن شعبہ وغیرہم رضی اللہ عنہم شامل ہیں) کو "حقیقی وشرعی وفقہی" باغی ثابت کرنے پر بہت زور دیتے ہیں، لیکن دوسری طرف تیسرے خلیفہ راشد سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں، فساد مچانے والوں اور آپ کو شہید کرنے والوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس بغاوت میں شامل بہت سے لوگ تائب ہو گئے تھے (جبکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ فسادی بعد میں بھی اپنی سازشوں سے باز نہ آئے اور جنگ جمل و صفین بھی انہی فسادیوں کی سازشوں کی وجہ سے ہوئی، بہرحال ابھی یہ ہمارا موضوع نہیں)، ملاحظہ فرمائیں! اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق، پہلے لکھتے ہیں:

> "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں جو لوگ شریک تھے وہ مجموعی طور پر منافق اور دشمنان اسلام کا ٹولہ تھے ..... ایسے لوگ گمراہی، فساد اور گناہ کبیرہ میں ضروری ملوث ہوئے، ان سے نفرت، بے زاری ظاہر کرنا ضروری ہے، سوائے اس کے کہ جس کی توبہ ثابت ہو چکی ہو"۔ ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۲۵.

لیکن پھر انہی" منافق اور دشمنان اسلام" کے بارے میں آگے لکھتے ہیں:

" بغاوت میں شامل بہت سے لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہے، معتبر روایات کے مطابق باغیوں میں سے بہت سے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سخت نادم ہوئے تھے اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے ندامت کا اظہار بھی کیا تھا....." ①

سوال یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے یہاں دعوی کیا ہے کہ" باغیوں میں شامل بہت سے لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہے" اور پھر اس کی دلیل کے طور پر لکھا ہے کہ" معتبر روایات کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بہت سے باغیوں کا نادم ہونا ثابت ہے" ، لیکن تاریخ طبری کی جس طویل روایت کا حوالہ حاشیہ میں دیا ہے اس کی سند میں ایک راوی" سیف بن عمر" بھی ہے، اور اس سیف بن عمر کو یہی اسماعیل ریحان صاحب صرف پانچ صفحے قبل" ضعیف" لکھ چکے ہیں (جلد ۲ صفحہ ۷۲۱).. نیز ایک جگہ سیف بن عمر کو ''بالاتفاق ضعیف'' بھی لکھا ہے (جلد ۲ صفحہ ۷۵۸) تو اگر واقعی سیف بن عمر بالاتفاق ضعیف ہے تو پھر یہ روایت جس سے اسماعیل ریحان صاحب باغیوں کا تائب ہونا ثابت کر رہے ہیں " معتبر روایات" کیسے ہوئیں؟؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی توبہ اور ندامت ثابت کرنے پر اتنا زور کیوں لگایا جا رہا ہے کہ" معتبر روایات" کا تڑکا لگانے سے بھی گریز نہ کیا گیا؟ اور اگر کوئی معتبر روایات تھیں تو

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۲۶، اور حاشیہ میں حوالہ دیا ہے: تاريخ الطبري ، ج ۴ ص ۳۹۲.

پھر ان کا حوالہ دینا چاہئے تھا، نہ کہ تاریخ طبری کی" سیف بن عمر" والی روایت کا جسے خود اسماعیل ریحان صاحب" ضعیف" لکھ آئے ہیں؟؟

اسماعیل ریحان صاحب کو ان سبائی شر پسندوں اور باغیوں سے کیا ہمدردی ہے کہ وہ یہ ثابت کرنے پر زور لگا رہے ہیں کہ ان میں سے بہت سوں نے توبہ کر لی تھی؟؟

روایت ''سنداً ضعیف'' لیکن پھر بھی ''بلاشبہ قابل قبول''؟ مگر کیسے؟

اپنی کتاب میں ایک جگہ" سنداً ضعیف" ایک روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

" اس روایت میں اگرچہ سنداً قدرے ضعف ہے مگر امام بخاری (صحیح بخاری میں نہیں بلکہ التاریخ الکبیر میں۔ناقل) اور امام احمد دونوں کا اسے نقل کرنا کچھ معنی رکھتا ہے اس لئے یہ روایت بلاشبہ قابل قبول ہے"۔ ①

ملاحظہ فرمائیں! سند کے اعتبار سے ایک ضعیف روایت کو صرف اس وجہ سے" بلاشبہ" قابل قبول قرار دیا جارہا ہے کہ یہ امام بخاری کی تاریخ کبیر اور مسند احمد میں موجود ہے۔نہ جانے یہ کونسا اصول روایت ہے؟؟

جبکہ اس کے برعکس امام شعبی رحمہ اللہ کا ایک قول جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

" جنگ جمل میں اصحاب رسول میں سے علی، عمار، طلحہ اور زبیر کے سوا کوئی شریک نہیں ہوا تھا، اگر لوگ پانچواں صحابی ثابت کر دکھائیں تو میں کذاب ہوں" جو کہ ان سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۲۰۲.

"امام شعبی کا یہ قول سنداً تو ثابت ہے مگر اسے من وعن حقیقت پر محمول نہیں کیا جا سکتا..... بہر کیف اس قول کو من وعن قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے"۔①

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۳۹.

عطاء بن یسار، یا عطاء بن ابی مسلم خراسانی؟

آنحضرت ﷺ کے دادا، عبدالمطلب کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

".....جاتے جاتے عبدالمطلب اپنے بیٹے ابوطالب (جن کا نام "عبد مناف" تھا۔ ناقل) کو حضور ﷺ کی دیکھ بھال کی وصیت کر گئے اور وہی آپ کے سرپرست بنے"۔ ①

اس بات کے لیے اسماعیل ریحان صاحب نے حاشیہ میں ایک تو "تاریخ ابن ہشام، ج۱ ص۱۷۹" کا حوالہ دیا ہے، اور دوسرا "تاریخ طبری ج۲ ص۲۷۷" کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے جس کی سند اور الفاظ یہ ہیں:

"حَدَّثَنَا ابْنُ حُمَيْدٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا سَلَمَةُ، قَالَ: حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بن أبي بكر: وكان عبد المطلب يوصي برسول الله ﷺ عمه أبا طالب"، اور پھر لکھا ہے:

"اس روایت کے مطابق عبدالمطلب نے پوتے کی سرپرستی کی وصیت ابوطالب کو کی تھی، سیرت ابن اسحاق، تاریخ طبری، سیرت ابن ہشام اور دلائل النبوۃ سمیت اکثر کتب سیرت میں ابن اسحاق کی منقطع سند سے یہ روایت نقل کی گئی ہے، چونکہ روایت کی سند ضعیف ہے، اس لیے

① تاریخ امت مسلمہ، ج۱ ص۱۴۷.

بعض حضرات اسے بالکل مسترد کر کے بڑے چچا حضرت زبیر کو سرپرست ثابت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ عبد المطلب کے جانشین زبیر تھے، وہی بڑے چچا تھے، مال دار بھی تھے جبکہ ابو طالب تنگ دست تھے، اس لیے وہ بھلا سرپرستی کیسے کر سکتے تھے، مگر یہ دعوی محض قیاس ہے، سنداً اس کا کوئی ثبوت نہیں، حضرت زبیر کی سرپرستی کی دلیل میں جن روایات کو پیش کیا جاتا ہے اول تو وہ بے سند ہیں، دوسرے ان میں حضور ﷺ کی کفالت کا سرے سے ذکر نہیں، بلکہ عبد المطلب کے بعد خاندان کی سرداری کا ذکر ہے..... یہ ضروری نہیں کہ جو جانشین ہو، خاندان کے چھوٹے بڑے سارے کام براہ راست اس کے ذمے ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ ابو طالب کو حضور ﷺ کی سرپرستی نصیب ہونے والی روایت فقط محمد بن اسحاق سے نہیں بلکہ دیگر اسناد سے بھی منقول ہے، محمد بن سعد نے ایسی متعدد اسناد ذکر کی ہیں جو اگرچہ ضعیف ہیں مگر ان میں ایک سند معاذ بن محمد الانصاری.....عن عطاء.....عن ابن عباس کی ہے، اس سند کے کم از کم حسن ہونے میں شبہ نہیں اور دیگر روایات کو ملا کر اسے صحیح لغیرہ کہا جا سکتا ہے، اس لیے ابو طالب کے رسول اللہ ﷺ کے سرپرست ہونے کی روایات یقیناً قابل قبول ہیں اور ان کی تردید محض متعصّبانہ قیاس پر مبنی ہے....." ①

اسماعیل ریحان صاحب کی اس تحقیق کا خلاصہ کچھ یوں نکلتا ہے کہ:

۱۔ آپ ﷺ کے دادا، عبد المطلب جاتے جاتے (یعنی اپنی وفات کے وقت۔

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۱۴۷۔۱۴۸ حاشیہ۔

ناقل) ابو طالب کو حضور ﷺ کی دیکھ بھال کی وصیت کر گئے تھے۔

۲۔اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اسماعیل ریحان صاحب نے سیرت ابن ہشام کا حوالہ دیا نیز تاریخ طبری سے" محمد بن اسحاق" کی ایک روایت پیش کی۔

۳۔اسماعیل ریحان صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ محمد بن اسحاق کی یہ روایت کچھ دوسری کتابوں میں بھی ہے لیکن اس کی سند منقطع ہے۔

۴۔اسماعیل ریحان صاحب کا کہنا ہے کہ کچھ حضرات اس روایت کو اس کی منقطع اور ضعیف سند کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عبد المطلب نے اپنے دوسرے بیٹے" زبیر بن عبد المطلب" کو اپنے بعد خاندان اور حضور ﷺ کا سرپرست مقرر کیا تھا، لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کفالت بھی ان کے ذمہ ہی تھی۔

۵۔اسماعیل ریحان صاحب ان حضرات کے دعوے کو محض قیاس پر مبنی بتا کر رد کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کے اس بات کا سنداً کوئی ثبوت نہیں اور اس بارے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں اول تو وہ بے سند ہیں، دوسرا ان میں حضور ﷺ کی کفالت کا سرے سے ذکر ہی نہیں بلکہ عبد المطلب کے بعد خاندان بنو ہاشم کی سرداری کا ذکر ہے۔

۶۔اسماعیل ریحان صاحب بتاتے ہیں کہ طبقات ابن سعد میں ابو طالب کی کفالت والی بات مختلف اسناد سے مذکور ہے، ان میں سے ایک" معاذ بن محمد الانصاری" والی سند کم از کم حسن ضرور ہے، بلکہ دوسری روایات کو ملا کر یہ روایت **صحیح لغیرہ** کے درجے کو پہنچ جاتی ہے لہٰذا ان روایات کو رد کرنا

محض متعصبانہ قیاس پر مبنی ہے۔

قارئین محترم! آگے چلنے سے پہلے آیئے طبقات ابن سعد کی اس روایت کا جائزہ لے لیتے ہیں جسے اسماعیل ریحان صاحب نے پہلے "حسن" اور پھر "صحیح لغیرہ" قرار دیا ہے، ابن سعد نے عنوان قائم کیا ہے: "ذِكْرُ أَبِي طَالِبٍ وَضَمِّهِ رَسُولَ اللهِ - ﷺ - إِلَيْهِ وَخُرُوجِهِ مَعَهُ إِلَى الشَّامِ فِي الْمَرَّةِ الأُولَى" (یعنی ابو طالب اور اس کے، اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے ساتھ ملانے کا ذکر، اور اسی کے ساتھ آپ ﷺ کے پہلی بار شام جانے کا بیان) اور آگے روایت کی سندیوں بیان کی ہے:

پہلی سند:

"قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ بْنِ وَاقِدٍ الأَسْلَمِيُّ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنِ ابْنِ أَبِي نَجِيحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ"

دوسری سند:

"قَالَ: وَحَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ مُحَمَّدٍ الأَنْصَارِيُّ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ"

تیسری سند:

"قَالَ: وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ صَالِحٍ وَعَبْدُ اللهِ بْنُ جَعْفَرٍ وَإِبْرَاهِيمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ أَبِي حَبِيبَةَ"

دَخَلَ حَدِيثُ بَعْضِهِمْ فِي حَدِيثِ بَعْضٍ. قَالُوا: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ قَبَضَ أَبُو طَالِبٍ رَسُولَ اللهِ - ﷺ - إِلَيْهِ فَكَانَ يَكُونُ مَعَهُ. وَكَانَ أَبُو طَالِبٍ لا مَالَ لَهُ. وَكَانَ يُحِبُّهُ حُبًّا شَدِيدًا لا

يُحِبُّهُ وَلَدَهُ. وَكَانَ لا يَنَامُ إِلا إِلَى جَنْبِهِ. وَيَخْرُجُ فيخرج معه.....الخ"۔①

قارئین محترم! سب سے پہلے یہ جان لیں کہ اس روایت میں صرف یہ بیان ہے کہ جب عبد المطلب کی وفات ہوگئی تو ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ ملا لیا، ابو طالب تنگ دست تھے لیکن وہ آپ ﷺ کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے اور آپ ﷺ بھی اپنے اس چچا کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے اور سویا بھی ان کے پاس ہی کرتے تھے۔

نیز اس عبارت میں "دَخَلَ حَدِيثُ بَعْضِهِمْ فِي حَدِيثِ بَعْضٍ" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ابن سعد نے تین سندیں ذکر کی ہے اور تینوں الگ الگ لوگوں کی بات کو ایک دوسرے میں داخل کر دیا ہے لہٰذا اب یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تینوں راویوں میں سے کس نے کیا بیان کیا۔

لہٰذا یہ بات ذہن میں رہے کہ اس روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے ثابت ہو کہ عبد المطلب نے اپنی وفات کے وقت ابو طالب کو وصیت کی تھی کہ میں اپنے اس پوتے کو تمہاری سرپرستی میں دیتا ہوں، بلکہ صرف یہ بیان ہے کہ ابو طالب نے خود آپ ﷺ کو اپنے ساتھ ملایا تھا، بلکہ طبری وغیرہ کی جن روایات کی طرف اسماعیل ریحان صاحب نے پہلے اشارہ کیا ہے ان میں بھی ایسا کوئی لفظ نہیں جس کا ترجمہ ہو کہ" عبد المطلب اپنی وفات کے وقت ابو طالب کو آنحضرت ﷺ کی دیکھ بھال کی وصیت کر گئے"، یہ" جاتے جاتے وصیت کرنے" کی بات اسماعیل ریحان صاحب کا اضافہ ہے۔

---

① الطبقات الکبری لابن سعد، ج ۱ ص ۹۶، دار الکتب العلمیة بیروت.

اب آیئے آپ کو اسماعیل ریحان صاحب کے "علم اسماء الرجال" کی ایک جھلک دکھاتے ہیں، انہوں نے طبقات ابن سعد کی مذکورہ بالا تین سندوں میں سے دوسری سند (معاذ بن محمد الانصاری عن عطاء عن ابن عباس) کو بنیاد بنا کر لکھا ہے کہ یہ سند کم از کم حسن ضرور ہے اور اگر دوسری (منقطع اور ضعیف۔ ناقل) روایات کو بھی ملا لیا جائے تو پھر یہ سند صحیح لغیرہ بھی بن جائے گی۔

قارئین محترم! اسماعیل ریحان صاحب نے اس سند میں مذکور "عطاء" سے مراد "عطاء بن یسار" بتائے ہیں اور ان کی وفات سنہ ۹۴ ہجری لکھی ہے ①، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ "عطاء" عطاء بن یسار نہیں بلکہ "عطاء بن ابی مسلم خراسانی" ہیں (ان کی وفات ۱۳۵ ہجری میں بتائی جاتی ہے)، "معاذ بن محمد الانصاری" کے تعارف میں ان کے شیوخ میں "عطاء الخراسانی" کا ہی ذکر ہے اور یہ بات "تهذيب الكمال" میں اسی صفحے پر مذکور ہے جس کا حوالہ معاذ بن محمد کو ثقہ ثابت کرنے کے لیے اسماعیل ریحان صاحب نے دیا ہے۔ ② اور یہ "عطاء الخراسانی" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے "مرسل" روایات بیان کرنے میں معروف ہیں، امام دارقطنی کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہی نہیں، امام ابوداود کہتے ہیں کہ نہ ہی انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو پایا ہے اور نہ ہی انہیں دیکھا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی یہ بات لکھی ہے۔ ③ اور خیر سے جس روایت کو اسماعیل ریحان صاحب "حسن" بتا کر پھر صحیح لغیرہ کے درجہ پر فائز کر رہے ہیں، وہ بھی یہ "عطاء خراسانی" سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت کر رہے ہیں جن سے نہ ان

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۱۴۷ حاشیہ۔

② دیکھیں: تهذيب الكمال، ج ۲۸ صفحہ ۱۲۔ ۱۳۔

③ دیکھیں: تهذيب التهذيب، ج ۷ ص ۲۱۲ طبع دائرة المعارف، الهند۔

کی ملاقات ثابت ہے اور نہ ہی انہیں دیکھا ہے، لہٰذا یہ سند بھی منقطع ہے، اگر یہ "منقطع السند" روایت "حسن" ہوسکتی ہے تو اسماعیل ریحان صاحب "محمد بن اسحاق" والی منقطع الاسناد روایات کو کیوں "ضعیف" بتاتے ہیں، انہیں بھی "حسن" لکھ دیتے؟

الغرض!

اسماعیل ریحان صاحب کی یہ بات بھی کسی صحیح متصل سند سے ثابت نہیں کہ عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت ابوطالب کو آنحضرت ﷺ کی دیکھ بھال کی وصیت کی تھی، ایسی تمام روایات کو خود اسماعیل ریحان صاحب بھی منقطع الاسناد اور ضعیف تسلیم کرتے ہیں، اور طبقات ابن سعد کی جس روایت کی ایک سند سے انہوں نے استدلال کیا ہے وہ سند بھی "منقطع" ہی ہے شاید اس بات سے وہ بھی واقف تھے اس لئے انہوں نے "عطاء الخراسانی" کو "عطاء بن یسار" بنا کر پیش کیا۔ واللہ اعلم۔

نوٹ: یہ بات ذہن میں رہے کہ دادا کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی کفالت کس کے ذمہ تھی یا کس نے آپ ﷺ کی دیکھ بھال کی؟ اس بات کا عقیدے یا ایمانیات سے کوئی تعلق نہیں کہ اتنی شد و مد کے ساتھ یہاں کسی ایک جانب کے موقف کو جزم ویقین کے ساتھ رد کیا جائے اور دوسرے کو ثابت کیا جائے، جب کہ کسی ایک طرف بھی کوئی "صحیح اور مستند" روایت موجود نہیں، یہاں ہمارا مقصد صرف اسماعیل ریحان صاحب کی اس تحقیق پر کچھ روشنی ڈالنا ہے جسے "تجدیدی کارنامہ" قرار دیا جارہا ہے۔

اسماعیل ریحان صاحب اور فن اسماء الرجال

جناب اسماعیل ریحان صاحب نے امام ذہبی کے حوالے سے ایک جگہ ایک روایت مع سند نقل کی ہے کہ: حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے یزید کو امیر المؤمنین کہنے والے کو بیس کوڑے لگوائے، انہوں نے اس روایت کی جو سند نقل کی وہ یہ ہے:

"قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي السري: حدثنا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ أَبِي غُنْيَةِ، عَنْ نَوْفَلِ بْنِ أَبِي الْفُرَاتِ، قَالَ: كُنْتُ عِنْدَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ، فَذَكَرَ رَجُلٌ يَزِيدَ، فَقَالَ: قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، فَقَالَ: تَقُولُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ؟ وَأَمَرَ بِهِ فَضُرِبَ عِشْرِينَ سَوْطًا" تاريخ الاسلام للذهبي .①

یہ روایت نقل کرنے کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے اس سند کے راویوں کا فرداً فرداً تعارف کروایا ہے، اور یہاں ایک عجیب چیز نظر آتی ہے، اوپر جو سند ذکر کی ہے اس میں کوئی بھی راوی "ابونوفل" نام کا نہیں، لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے "نوفل بن ابی الفرات" کی جگہ کسی "ابونوفل" کا نام لکھ کر اسے امام ذہبی کے حوالے سے "معتبر" لکھا ہے اور آگے چل پڑے ہیں، اور لکھ دیا ہے کہ "رجال کے احوال سے ظاہر ہے کہ یہ درمیانے درجے کے ثقات کی روایت ہے"۔

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۹۵ مع حاشیہ.

اگر تو انہوں نے غلطی سے" نوفل بن ابی الفرات" کو" ابونوفل" سمجھ لیا ہے تو پھر یہ غلطی ہی ہوگی، لیکن اگر انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو یہ صریح طور پر خیانت ہے، کیونکہ" ابونوفل" اور" نوفل بن ابی الفرات" ایک شخصیت نہیں.....

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے یہ ذکر کیا ہے کہ حافظ ابن حجر نے یہی روایت ایک دوسری سند سے نقل کی ہے جو کہ یہ ہے:

"قال يحيى بن عبد الملك بن ابي غنية احد الثقات ثنا نوفل بن ابي العقرب ثقة قال كنت عند عمر بن عبد العزيز ..الخ"

یہاں چونکہ" نوفل بن ابی الفرات" کے بجائے" نوفل بن ابی العقرب" آیا ہے جبکہ سند وہی ہے جو علامہ ذہبی نے لکھی ہے بلکہ حافظ ابن حجر نے پہلا راوی " محمد بن ابی السری" بھی حذف کر دیا، تو اب اسماعیل ریحان صاحب کو علم تھا کہ ایک جگہ" نوفل بن ابی الفرات" آیا ہے جبکہ دوسری جگہ" نوفل بن ابی العقرب" آیا ہے تو انہوں نے ایک دم اسے" دوسری سند" قرار دے دیا، جبکہ یہ سند ایک ہی ہے اور اس راوی کے نام میں اختلاف ہوا ہے..لیکن اسماعیل ریحان صاحب تو دونوں سندوں میں اس" نوفل" کو" ابونوفل" ہی سمجھے بیٹھے ہیں، ان کے نزدیک تو راوی میں بھی اختلاف نہیں۔

بہرحال! یہ روایت ایک تو منقطع ہے، کیونکہ علامہ ذہبی نے اسے شروع ہی: **قال محمد بن ابي السري** سے کیا ہے (کہ محمد بن ابی السری نے کہا)، جن کا نام **"محمد بن متوكل المعروف بابن السري"** ہے ان کی وفات سنہ ۲۳۸ ہجری میں ہوئی جبکہ علامہ ذہبی کی پیدائش ۶۷۳ ہجری ہے، درمیان میں چار سو سالہ سے زیادہ کی مدت ہے جس کی سند علامہ ذہبی نے ذکر ہی نہیں کی، اور

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو "محمد بن ابي السرى" کا بھی نام حذف کر کے سند شروع ہی "يحيى بن عبد الملك بن ابي غنية" سے کی ہے اور درمیان کی سند کا کوئی پتہ نہیں.....

اور مزے کی بات یہ کہ اسماعیل ریحان صاحب اسی صفحہ پر ابن شوذب سے مروی ایک روایت کو "منقطع الاسناد" بتا کر ہی رد کر رہے ہیں، اور اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ دوسری "منقطع السند" روایت ہی پیش کر رہے ہیں۔

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے ایک غلطی یہ کی ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ والی سند کے بعد لکھا ہے:

"اس سند میں نوفل بن ابی عقرب ہیں جو بخاری و مسلم رحمہما اللہ کے راوی ہیں اور ثقہ ہیں"۔ ①

اور اسماعیل ریحان صاحب نے اس بات کے لیے حوالہ دیا ہے: تاریخ الاسلام للذہبی اور تقریب التهذیب کا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "نوفل بن ابی عقرب" نامی راوی ہرگز بخاری و مسلم کا راوی نہیں ہے بلکہ اس نام کا راوی ہمیں ہزار تلاش کے بعد کہیں ملا ہی نہیں، اور جب ہم نے اسماعیل ریحان صاحب کے لکھے حوالوں "تاریخ الاسلام" اور "تقریب التهذیب" کے مطلوبہ مقامات دیکھے تو وہاں "نوفل" نہیں بلکہ "ابو نوفل بن ابي العقرب" کا تعارف ہے، جسے اسماعیل ریحان صاحب نے "نوفل" بنا دیا، جبکہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ والی سند میں تو "نوفل بن ابی الفرات" تھا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۹۵ حاشیہ۔

(نہ کی "بن ابی عقرب") تو وہاں بھی اسماعیل ریحان صاحب نے اس کا نام "ابونوفل" لکھ کر اسے معتبر بتا دیا۔

نوٹ: یہاں صرف اسماعیل ریحان صاحب کی دو غلطیوں کی نشاندھی مقصود تھی، اس روایت کی حیثیت پر کلام ابھی مقصود نہیں وہ پھر کبھی۔

بغاوت کسے کہتے ہیں؟

اسماعیل ریحان صاحب نے ایک" خاص مقصد" کے لیے اپنی کتاب میں "بغاوت" کی تعریف میں یہ شرط بطور خاص ذکر کی ہے کہ:

"بغاوت کا اطلاق ہونے کے لیے علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے"۔ ①

"خروج کی شرعی تعریف کے اطلاق کے لیے صرف بیعت سے انکار کافی نہیں بلکہ کسی علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل اہل جمل بصرہ پر اور اصحاب صفین شام پر قابض تھے، اس لیے وہاں خروج کا اطلاق ہوگیا"۔ ②

"جمہور علمائے اسلام کی کتب میں جہاں بھی اہل شام یا اہل جمل کے لیے باغی کا لفظ آیا ہے، وہ فقہی اصطلاح کے طور پر ہے، یعنی ا: جو شرعی حکمران کی اطاعت نہ کرے۔ ۲: کسی علاقے پر قابض ہو جائے، شرعاً باغی کی تعریف کا حاصل یہی ہے"۔ ③

ان اقتباسات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ کسی کو اس وقت تک" باغی" نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ ریاست کے کسی علاقے پر قابض بھی نہ ہو جائے، وہ چاہے ریاست کے خلاف مسلح خروج کرے، جتھہ بندی کر کے نظام مملکت کو مفلوج

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۶۹.
② حوالہ مذکورہ ص ۹۸۱.
③ حوالہ مذکورہ ص ۸۲۱.

کرنے کی کوشش کرے، قتل و غارت کرے، وہ اس وقت تک فقہی باغی نہ کہلائے گا جب تک وہ کسی خاص علاقے پر قابض بھی نہ ہو جائے۔

اب اسماعیل ریحان صاحب کے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"جہاں تک خوارج کا تعلق ہے، ان کے باغی ہونے سے بھلا کسے انکار ہے.....اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہی لحاظ سے خوارج بھی باغی تھے جیسا کہ ان کے باغیانہ افعال سے واضح تھا، نیز ان کی بغاوت تاویل اور اجتہاد سے خالی تھی، اس لئے وہ صرف باغی نہیں، بلکہ گمراہ اور گناہ گار بھی تھے"۔ ①

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں جو لوگ شریک تھے وہ مجموعی طور پر منافق اور دشمنان اسلام کا ٹولہ تھے"۔ ②

خود اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والوں کو بھی "باغی" ہی لکھا ہے، چنانچہ "سبائی جماعت کا راست اقدام" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

".....اس کے فوراً بعد باغیوں نے مدینہ منورہ کے اکابر صحابہ: حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے جعلی خطوط تیار کرا کے راتوں رات کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے شہروں میں پھیلا دیے...الخ"۔ ③

پھر آگے ایک عنوان قائم کرتے ہیں:

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۷۴۔
② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۲۵۔
③ حوالہ مذکورہ ص ۱۲۹۔

"باغیوں کی اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے الگ الگ ملاقاتیں" ①

پھر صفحہ ۱۳۳ اور ۱۳۴ پر متعدد بار انہیں "باغی" لکھا، صفحہ ۱۳۵ پر عنوان قائم کیا "باغی مسجد نبوی میں"، پھر آگے لکھا:

"باغی چند دنوں تک مدینہ میں دندناتے رہے، مدینہ کے لوگ فساد کے ڈر سے گھروں میں بیٹھ گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس دوران مسجد نبوی میں نمازیں پڑھاتے رہے..... جمعے کا دن آیا تو آپ نے منبر پر خطبہ دیا، اس دوران باغیوں نے ہنگامہ کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کنکروں کی بارش کر دی، آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے اور غشی طاری ہو گئی....."

اس کے بعد بار بار ان لوگوں کو "باغی" ہی لکھا گیا ہے، اور پھر صفحہ ۱۴۱ پر "سازشی تحریک کا تیسرا رُخ: سانحہ شہادت" کا عنوان دے کر لکھتے ہیں:

"باغی خلیفہ سے استعفاء لینے میں بھی ناکام ہو چکے تھے اس لئے سازشی منصوبے کے تیسرے رُخ کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا گیا....."۔

پھر اسی صفحے پر "اشتر نخعی" کو "صف اول کا باغی" بھی لکھا ہے۔

آگے ایک جگہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مقام و مرتبے کی پیش نظر مدینہ کے اکثر مہاجرین و انصار انہی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، عام باغی بھی انہی کے دامن میں پناہ لینا چاہتے تھے، ان کا گروہ مدینہ منورہ میں شدید بدامنی کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ من مانی کر کے کسی کو

① ج ۲ ص ۱۳۱.

خلیفہ بنا دیتا، فیصلہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے پر ہی ہوسکتا تھا"۔ ①

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والے اور انہیں شہید کرنے والوں کی طاقت صرف اتنی تھی کہ انہوں نے مدینہ میں بدامنی پھیلائی، ان کا مدینہ منورہ پر اس طرح کا قبضہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی من مانی کر کے خود خلافت پر قبضہ کر لیتے یا اپنی مرضی سے جسے چاہتے اسے خلیفہ بنا دیتے۔

الغرض! مدینہ منورہ میں آ کر خلیفہ راشد کے خلاف فساد مچانے والوں کو خود اسماعیل ریحان صاحب بھی" باغی" ہی لکھتے ہیں، لیکن جو بغاوت کی تعریف میں "کسی علاقے پر قبضہ کرنے" کی شرط انہوں نے ایک خاص غرض اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے لگائی ہے اس کی رو سے یہ لوگ باغی نہیں بنتے کیوں کہ انہوں نے باقاعدہ مدینہ یا کسی اور شہر پر قبضہ نہیں کیا تھا، نہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

اب آگے پڑھیں کیا لکھتے ہیں:

"جمہور فقہاء کی رائے میں کسی علاقے پر کنٹرول قائم کرنے والے لوگ، چاہے وہ خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کریں اور چاہے وہ جائز مطالبہ لے کر کھڑے ہوں، تب بھی ان کا عمل خروج کہلائے گا، خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اور عمل بھی اس کے مطابق تھا، حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہیں معزول کرنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا..... انہوں نے ایک مسلح جماعت کے ساتھ ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومتی مشینری کو بے بس کر دیا تھا، اس

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۶۲.

لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر خروج کا اطلاق کیا اور ان کے مقام کا لحاظ کیے بغیر انہیں ان کے متعدد رفقاء سمیت سزائے موت دی تاکہ ملک کا نظم وضبط متاثر نہ ہو"۔ ①

اس اقتباس کو غور سے پڑھیں، حجر بن عدی (جو اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک صحابی ہیں اور انہی کے مطابق سبائی گروہ کی سرپرستی بھی کرتے تھے) پر "خروج" کا الزام درست ثابت کیا جا رہا ہے، اس اقتباس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حجر بن عدی کے بارے میں کیے گئے فیصلے کو جمہور فقہاء کے مطابق ہی بتایا جا رہا ہے، لیکن اسماعیل ریحان صاحب یہ کبھی بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ حجر بن عدی یا کسی مسلح جماعت نے کسی خاص علاقے پر باقاعدہ قبضہ کر لیا تھا، بلکہ اسماعیل ریحان صاحب بھی "ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومتی مشینری کو بے بس کرنے" کی بات ہی لکھ رہے ہیں، لیکن ان علاقوں پر تسلط اور قبضہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر کا ہی تھا، لیکن اس کے باوجود حجر بن عدی کو "خروج کرنے والا" (یعنی بغاوت کا مرتکب) قرار دیا جا رہا ہے، کیوں؟؟ کیا یہاں "کسی خاص علاقے پر قبضہ" کی شرط پائی جاتی ہے؟؟

آگے پڑھیں، واقعہ حرہ کے بارے میں اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں؟

"اکابر مدینہ نے طے کیا کہ وہ حکومت کو خلافت راشدہ کے دور کی طرح مہاجرین و انصار کی رضامندی اور شورائیت کے اصول پر چلائیں گے نہ کہ موروثی نظام پر، اہل مدینہ نے ایک شہری حکومت

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۸۶.

ترتیب دی.....ان حضرات نے شہر کا انتظام سنبھال کر یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان اور بنو امیہ کے دیگر افراد کو مدینہ منورہ سے نکال دیا....."۔ ①

ہم یہاں اسماعیل ریحان صاحب کی اس اقتباس میں کئی غلط بیانیوں سے صرف نظر کرتے ہیں کہ" اکابر مدینہ" نے اس خروج سے روکا تھا یا اس کی تائید کی تھی، اور کیا یہ خروج خلافت راشدہ کے نظام کو واپس لانے کے لیے تھا یا وجہ کچھ اور تھی؟، ابھی بتانا یہ ہے کہ اس وقت ایک حکومت قائم تھی، واقعہ کربلاء کو دو تین سال گذر چکے تھے، کہیں بھی کسی قسم کی کوئی شورش یا بغاوت موجود نہ تھی، مدینہ منورہ میں اسی حکومت کا نمائندہ گورنر کام کر رہا تھا، یزید کو آپ چاہے فاسق بھی کہتے رہیں، احادیث صحیحہ کی رو سے حکمران کے خلاف اس وقت تک خروج ناجائز ہے جب تک اس سے کفر صریح کا ظہور نہ ہو، خود اسماعیل ریحان صاحب، لکھ چکے ہیں:

" چاہے کوئی حکمران امت کی رضا و رغبت کے بغیر کسی بھی طریقے سے ریاست کا کنٹرول حاصل کر چکا ہو تو اس کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنے والا بہر حال باغی ہی ثابت ہوگا، یہی جمہور فقہاء کا مسلک ہے" (بلکہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع لکھا ہے۔ ناقل) ②

الغرض! ان خروج کرنے والوں پر اسماعیل ریحان صاحب کی" بغاوت" کی بیان کردہ تعریف مکمل طور پر صادق آتی ہے، لیکن یہاں چونکہ اُم المؤمنین عائشہ، حضرات طلحہ و زبیر و معاویہ (رضی اللہ عنہم) سامنے نہیں، اس لیے لکھتے ہیں:

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۲.

② ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۷۲.

''..... یہ حضرات اپنے فیصلے میں مجتہد تھے اس لئے ان کی جد و جہد پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ سمیت امت کی اکثریت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی وجہ سے یزید کی بیعت برقرار رکھی جن میں حکام کی بیعت توڑنے سے منع کیا گیا ہے چاہے وہ ظالم و فاسق ہوں، بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے خیال میں یزید کا فسق ثابت نہ تھا، جیسے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ''۔ ①

تو کیا یہاں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ کیا صرف حضرات عائشہ وطلحہ وزبیر ومعاویہ (رضی اللہ عنہم) کے اجتہادی فیصلوں پر ہی" حرف گیری" کی جاسکتی ہے؟؟ اور جب آپ کی ہی بیان کردہ بغاوت کی تعریف کسی اور پر لگتی ہو تو وہاں حرف گیری سے آپ کسی کو کیوں اور کیسے روک سکتے ہیں؟؟ کسوٹی تو سب کے لئے ایک ہی ہونی چاہیے ناں؟؟

بہرحال! اسماعیل ریحان صاحب نے ایک" خاص مقصد" کے لیے اپنی کتاب میں" بغاوت" کی تعریف میں یہ شرط بطور خاص ذکر کی ہے کہ:

" بغاوت کا اطلاق ہونے کے لیے علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے" ②

" خروج کی شرعی تعریف کے اطلاق کے لیے صرف بیعت سے انکار کافی نہیں بلکہ کسی علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل اہل جمل بصرہ پر اور اصحاب صفین شام پر قابض تھے، اس لیے وہاں خروج کا اطلاق ہوگیا"۔ ③

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۳۵.

② حوالہ مذکورہ ص ۹۶۹.

③ حوالہ مذکورہ ص ۹۸۱.

" جمہور علمائے اسلام کی کتب میں جہاں بھی اہل شام یا اہل جمل کے لیے باغی کا لفظ آیا ہے، وہ فقہی اصطلاح کے طور پر ہے، یعنی ا: جو شرعی حکمران کی اطاعت نہ کرے۔ ۲: کسی علاقے پر قابض ہو جائے، شرعاً باغی کی تعریف کا حاصل یہی ہے"۔ ①

ان اقتباسات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ کسی کو اس وقت تک " باغی" نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ ریاست کے کسی علاقے پر قابض بھی نہ ہو جائے، وہ چاہے ریاست کے خلاف مسلح خروج کرے، جتھہ بندی کر کے نظام مملکت کو مفلوج کرنے کی کوشش کرے، قتل و غارت کرے، وہ اس وقت تک فقہی باغی نہ کہلائے گا جب تک وہ کسی خاص علاقے پر قابض بھی نہ ہو جائے...اسماعیل ریحان صاحب نے یہ شرط ایک خاص مقصد کے تحت لگائی ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں، وہ کچھ لوگوں کو بہرصورت باغی بنانا چاہتے ہیں اور کچھ ایسے لوگوں کو جنہوں نے ایک قائم شدہ حکومت کے خلاف باقاعدہ مسلح خروج کیا اور وہ سب کچھ کیا جس پر بغاوت کا اطلاق ہوتا ہے انہیں باغی ہونے سے بچانا چاہتے ہیں، اس پر ہم آگے بات کریں گے۔

پھر ہم نے اسماعیل ریحان صاحب کی ہی کتاب سے کچھ ایسی مثالیں پیش کیں جہاں انہوں نے ایسے لوگوں کو" باغی" لکھا جن کا کسی خاص علاقے پر باقاعدہ قبضہ ہوا ہی نہیں تھا، اسی سلسلے کی ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۱.

عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت

خلیفہ عبد الملک بن مروان کے دور میں ہونے والی ایک بغاوت کے بارے میں جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"عبد الملک بن مروان کی زندگی کا آخری اور سب سے کڑا امتحان عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت تھی اس عالی حوصلہ اور جنگ آزما سالار کو خراسان کے محاذ پر بھیجا گیا تھا تاکہ وہاں کی مسلسل بغاوتوں پر قابو پایا جائے دراصل جنوبی خراسان میں مقامی آتش پرست سردار رُتبیل مسلمانوں کے لیے دردسر بنا ہوا تھا.."

آگے لکھتے ہیں:

"وہ تھوڑے تھوڑے علاقے پر قبضہ کرکے اس کی حفاظت کا مکمل بندوبست کرتا اور پھر آگے قدم بڑھاتا، اس طرح رُتبیل کے جال میں پھنسے بغیر اس نے موسم سرما سے پہلے جنوبی خراسان کا آدھا حصہ بازیاب کرالیا، اس کے بعد پڑاؤ ڈال کر حجاج کو (جو عبد الملک بن مروان کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ناقل) فتوحات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: اس سال ہم نے جتنے علاقے پر قبضہ کرلیا ہے وہ کافی ہے، اگلے علاقوں کا جائزہ لے کر ہم آئندہ سال پھر پیش قدمی کریں گے.."①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۴.

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

۱۔عبدالرحمٰن بن اشعث کا یہ خروج اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک" بغاوت" تھا (کہ انہوں نے اسے لفظ" بغاوت" سے ہی تعبیر کیا ہے)

۲۔عبدالرحمٰن بن اشعث ایک سالار تھا، جو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے ماتحت تھا، اور اسی نے اسے خراسان کے محاذ پر بھیجا تھا اور بھیجنے کا مقصد " وہاں بغاوتوں پر قابو پانا" تھا۔

۳۔عبدالرحمٰن بن اشعث، باقاعدہ حجاج بن یوسف کو رپورٹ بھی دیا کرتا تھا اور اس کی ہدایات کے مطابق چلا کرتا تھا۔

اب آگے اسماعیل ریحان صاحب" خروج کے اسباب" کی سرخی لگا کر لکھتے ہیں:

" حجاج بن یوسف کو عبدالرحمٰن بن اشعث سے پہلے ہی کچھ حسد تھا، یہ خط پڑھ کر اس نے پیش قدمی روکنے کے منصوبے کو مسترد کر دیا اور جواب میں لکھا: تمہاری تحریر دشمن سے صلح جوئی کے ذہن کی عکاسی کر رہی ہے، یہ وہ دشمن ہے جس نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اللہ کی قسم تمہاری تجویز کسی منصوبہ بندی پر نہیں بزدلی پر مبنی ہے، فوراً آگے بڑھو اور دشمن کے قلعے کو مسمار کر دو اور سپاہیوں کو قتل کرتے چلے جاؤ.. ابھی عبدالرحمٰن یہ خط پڑھ کر شش و پنج میں تھے کہ حجاج کا دوسرا تاکیدی خط ملا، جس میں لکھا تھا: آگے بڑھ کر دشمن کی سرزمین کو روند ڈالو، ورنہ فوج کی کمان اپنے بھائی کو دے کر الگ ہو جاؤ، حجاج کی یہ بے جا سختی عبدالرحمٰن بن اشعث جیسے اعلی افسر کے لیے سخت

صدمے کا باعث بنی، اسے یقین ہو گیا کہ حجاج صرف دشمنی نکالنے کے لئے اسے موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے فوج کو جمع کر کے تقریر کی ...." (آگے اس کی تقریر نقل کی ہے جس میں اس نے فوج کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ ناقل) ①

اس اقتباس میں اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یہ سمجھا رہے ہیں کہ:

۱۔ حجاج کو عبد الرحمٰن بن اشعث کے ساتھ پہلے ہی سے حسد تھا (لیکن اس کے باوجود وہی حجاج عبد الرحمٰن بن اشعث کو ہی لشکر کا سالار بنا کر خراسان کی طرف بھیجتا ہے۔ ناقل)

۲۔ جب حجاج نے اپنے ماتحت اس سالار کو پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا تو اس سالار نے لشکر کو جمع کر کے تقریر کی اور اسے حکومت کے خلاف خروج پر اکسایا (اور ظاہر ہے اس وقت خلیفہ عبد الملک بن مروان تھے، حجاج تو صرف عراق کا گورنر تھا۔ ناقل)

۳۔ حجاج نے عبد الرحمٰن بن اشعث کو یہ بھی لکھا کہ اگر تم پیش قدمی جاری نہیں رکھ سکتے تو اپنے بھائی کو کمان دے کر الگ ہو جاؤ۔

اب آگے چلیں، اسماعیل ریحان صاحب، عبد الرحمٰن بن اشعث کی عبد الملک بن مروان کے گورنر، حجاج کے خلاف لشکر کشی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" عبد الرحمٰن بن اشعث نے پہلے اپنے حریف رُتبیل سے (جسے پہلے آتش پرست سردار لکھ آئے ہیں ناقل) صلح کر لی تا کہ پشت سے حملے

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۴.

کا خطرہ نہ رہے، پھر عراق کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اس لشکر کا نعرہ "یا ثارات الصلوۃ" (ہائے نماز کا انتقام) تھا کیونکہ حجاج نمازوں میں اکثر دیر کرا دیتا تھا"۔ ①

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ عبد الرحمٰن بن اشعث نے اپنی اس بغاوت کے جواز کے لیے وجہ یہ مشہور کی کہ حجاج نمازوں میں دیر کرا دیتا ہے۔

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے عبد الرحمٰن بن اشعث اور حجاج بن یوسف کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کا حال لکھا ہے جس کے مطابق اس سلسلے کا سب سے بڑا معرکہ "دیر جماجم" نامی مقام پر ہوا، جس میں عبد الرحمٰن بن اشعث کے لشکر کو شکست ہوئی لیکن عبد الرحمٰن بن اشعث بچ نکلا.. اور اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے جو لکھا وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

"اس میں شک نہیں کہ دیر جماجم کے اکثر حریت پسند مخلص تھے، اللہ کے دین کو خالص خلافت راشدہ کے انداز میں نافذ کر کے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چاہتے تھے، ان شاء اللہ ان کے مقتولین کے ساتھ اللہ کے ہاں رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوا ہوگا"۔

اور آگے لکھا:

"ان کا یہ عمل بہادری و حمیت کے لحاظ سے قابل فخر ہے..... ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں"۔ ②

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۵.

② حوالہ مذکورہ ص ۶۰.

۱۔ جو اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک پہلے "باغی" تھے، اب وہ "حریت پسند" ہو گئے۔

۲۔ جنہیں بغاوتوں پر قابو پانے کے لئے بھیجا گیا تھا، انہوں نے صرف اس لئے خود بغاوت کی تھی کہ جس کے حکم کے تحت یہ جنگ کے لئے گئے تھے اور جس کے حکم کے یہ تابع تھے، اس نے انہیں پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا تھا، لیکن اب ان کی اس بغاوت کا مقصد خالص خلافت راشدہ کے انداز میں دین نافذ کرنا بتایا جا رہا ہے، دوسرے لفظوں میں جب ابن اشعث لشکر کا امیر بن کر روانہ ہوا تھا اس وقت ملک میں "خلافت راشدہ" کا نظام نافذ تھا، اور حجاج نمازوں میں دیر نہیں کروایا کرتا تھا، ورنہ اسی وقت بجائے آتش پرستوں کے خلاف لشکر کشی کرنے کے، خالص خلافت راشدہ کے نظام کے نفاذ اور نمازوں کے لیے جنگ کرتا۔

۳۔ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں اور ان کا یہ عمل قابل فخر تھا۔

نوٹ: یہ ذہن میں رہے کہ عبد الرحمٰن بن اشعث کا یہ خروج یا بغاوت، عبد الملک بن مروان کے دور کے آخری زمانے کا واقعہ ہے، اور اس زمانے کے بارے میں یہی اسماعیل ریحان صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ:

> " تیسرا دور عبد الملک کی خلافت قائم ہونے کے بعد کا ہے، ان ۱۳ سالوں میں ہم اسے ایک ذمہ دار اور معتدل مزاج حکمران کے روپ میں دیکھتے ہیں، جو سخت ضرورت پر سزا بھی دیتا ہے اور عام طور پر درگذر کا معاملہ کرتا ہے، جو فاتح اور خوش بخت ہے، جس کو ہر دشمن پر فتح

نصیب ہوتی ہے، رعایا اس کے گن گاتی ہے اور اہل علم وفضل اس کے گرد جمع ہوتے ہیں"۔

نیز لکھتے ہیں:

"بڑا عالم و فاضل آدمی تھا، مؤرخین کہتے ہیں کہ اس دور میں مدینہ منورہ میں چار بڑے فقہاء تھے، سعید بن مسیب رحمہ اللہ، عروہ بن زبیر رحمہ اللہ، قبیصہ بن ذؤیب رحمہ اللہ اور چوتھا عبد الملک (یہاں اسماعیل ریحان صاحب" رحمہ اللہ" لکھنا شاید بھول گئے۔ ناقل)" ①

اب ہمارے سوال یہ ہیں کہ:

جب عبد الرحمٰن بن اشعث کو حجاج نے لشکر کا سالار بنا کر خراسان بھیجا تھا تو کیا اس وقت حجاج نمازوں کو وقت پر ادا کیا کرتا تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو عبد الرحمٰن بن اشعث نے اس وقت اس کے خلاف خروج کیوں نہ کیا؟، عبد الرحمٰن بن اشعث کو یہ بات اس وقت کیوں یاد آئی جب حجاج نے اسے پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا تھا؟، اگر وہ زمینی حقائق کی وجہ سے اس وقت پیش قدمی کو نقصان دہ سمجھتا تھا تو کمان اپنے بھائی کو دے کر الگ ہو جاتا، آخر خلیفہ کی طرف سے ان محاذوں کی ذمہ داری حجاج بن یوسف کو ہی دی گئی تھی اور ان محاذوں کا کمانڈر انچیف وہی تھا۔

اسماعیل ریحان صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ" حجاج کو عبد الرحمٰن بن اشعث سے پہلے ہی کچھ حسد تھا"، لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ حسد کس وجہ سے تھا؟ نیز اگر حسد تھا تو حجاج نے ہی اسے لشکر کا سالار کیوں بنایا؟

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۸.

کیا حجاج کا اسے یہ حکم دینا کہ: " وہ دشمن جس نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اس کے خلاف پیش قدمی جاری رکھو اور اس کے قلعے مسمار کردو اور سپاہیوں کو قتل کردو، اس کی سرزمین کو روند ڈالو" یہ کوئی ایسا حکم تھا جو خلاف شریعت تھا؟ یا ایسا حکم تھا جس کی وجہ سے عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت کو جائز اور قابل فخر عمل کہا جاسکے؟

پھر ایک جگہ اسماعیل ریحان صاحب نے عبدالملک بن مروان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> " سنہ ۷۰ ہجری میں جب رومیوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالم اسلام کی سرحدوں پر تاخت وتاراج شروع کی تو عبدالملک نے ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کرنے کی پیش کش کرکے ان سے صلح کرلی تاکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکے، یہ طرز عمل دور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیاست کے برعکس تھا.." ①

تو سوال ہے کہ عبدالرحمٰن بن اشعث نے جو بقول اسماعیل ریحان صاحب اسی آتش پرست " رُتبیل" سے صلح کرلی جس کے خلاف لڑنے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا تاکہ اسے پشت سے حملے کا خطرہ نہ رہے" تو کیا یہ طرز عمل دور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیاست کے مطابق تھا جو اسماعیل ریحان صاحب نے اس خروج کو" بہادری وحمیت کے لحاظ سے قابل فخر" لکھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ" انہیں مجرم قرار دینا درست نہیں" ؟؟؟

کیا یہی اسماعیل ریحان صاحب یہ نہیں لکھ آئے کہ:

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۷.

"شرعی احکام میں اللہ نے کسی بشر کو مستثنیٰ نہیں رکھا، رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف عملاً بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر بعض حدود نافذ کیں بلکہ قولاً بھی فرما دیا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔ ①

اور کیا وہ یہ نہیں لکھ آئے کہ:

"..یہ طے ہے کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے مطابق ظالم و فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھنا شرعاً درست نہ تھا.." (جبکہ وہ عبدالملک بن مروان کو فاسق وظالم بھی نہیں لکھتے۔ناقل) ②

اور کیا یہی مسلک وہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور جمہور فقہاء کا نہیں لکھ آئے؟ ③

اور کیا وہ یہ نہیں لکھتے کہ:

"اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمران کے ذاتی فسق کی وجہ سے خروج جائز نہیں ہوتا"۔ ④

اور

"جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم وائمہ مجتہدین کے نزدیک خروج کا جواز یا وجوب کفر بواح (کھلم کھلا کفر) کے ارتکاب پر ہوا کرتا ہے" ⑤

اور

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۹۸.
② حوالہ مذکورہ ص ۵۵۰.
③ حوالہ مذکورہ ص ۶۷۲.
④⑤ حوالہ مذکورہ ج ۳ ص ۲۵۳.

"... دوسری صدی ہجری کے دوران اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہو گیا (جسے دوسرے لفظوں میں اجماع کہا جاتا ہے۔ ناقل) کہ حکام کے ظلم وستم پر صبر وتحمل کرنا اور خروج نہ کرنا واجب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کو بدلتا دیکھ کر فقہاء نے اپنے طور پر دین میں تبدیلی کر لی تھی اور یہ نئے احکام ایجاد کر لیے، ہرگز نہیں بلکہ یہ ہدایات قرآن وسنت کی نصوص میں پہلے سے موجود تھیں... الخ" ①

اور

"صرف معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں"۔ ②

اور کیا وہ یہ نہیں لکھ آئے کہ:

"ارشادات نبویہ کی بناء پر جمہور امت کا مسلک شروع سے یہ رہا ہے کہ حکمران چاہے فاسق وفاجر ہو مگر جب تک کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے"۔ ③

تو یہاں ایسی کیا مجبوری پیش آئی کہ عبدالرحمٰن بن اشعث کے خروج کو جو کہ سراسر مسلمانوں کے ایک دشمن کے خلاف پیش قدمی جاری رکھنے کے لئے کمانڈر انچیف کی طرف سے ملنے والے حکم کو نہ ماننے کی وجہ سے ہوا، اور جسے خود اسماعیل ریحان صاحب نے شروع میں "بغاوت" کہا، اب اسے "حریت پسندی" کہا جا رہا ہے اور اسے "قابل فخر کارنامہ" کہا جا رہا ہے؟؟ جبکہ وہی ہمیں بتاتے ہیں کہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۱۔ ۶۲.
② حوالہ مذکورہ ص ۶۳.
③ حوالہ مذکورہ ج ۲ ص ۵۱۰.

ایسا خروج جائز نہیں اور ان کے مطابق ہی یہ بات قرآن وسنت کی نصوص میں پہلے سے موجود تھی، اسماعیل ریحان صاحب تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے معاملے میں بھی ایسی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں جبکہ عبدالرحمٰن بن اشعث اور اس کے ساتھ بغاوت میں شامل ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نہیں تھے کہ ہمیں وہاں ان کے اس عمل کو "اجتہادی غلطی" بنانے کا احسان کرنا پڑے.... کہیں ایسا اس لیے تو نہیں کہ چونکہ یہ بغاوت بنی امیہ کے ایک خلیفہ کی حکومت کے خلاف تھی اس لیے یہ "حریت پسندی" اور "قابل فخر" سمجھی جائے گی؟، اور اگر بنی امیہ کے خلاف کوئی بغاوت کرے اور سراسر بلا وجہ کرے اسے کھینچ تان کر "حریت پسندی"، "نظام خلافت راشدہ کو واپس لانے کی جدوجہد" اور "قابل فخر کارنامہ" کہا جائے گا؟؟

کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان ہونے والے اجتہادی مشاجرات واختلافات کے بارے میں بعد والوں کو قطعی فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

" یہ بات اصولی طور پر غلط ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو مصیب اور کسی کو خاطی کہنے کا اختیار بعد والوں کو نہیں، بلکہ اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو یہ اختیار ہے، ضروری نہیں کہ کسی معاملے میں غلط یا صحیح بتانے کے لیے ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس رہنمائی فرمائیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ارشادات اس بارے میں تا قیامت کافی ہیں"۔ ①

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" رہی یہ بات کہ دیگر اجتہادی مسائل کی طرح یہاں ایک کی خطاء اور دوسرے کی اصابت ظنی کیوں نہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر اصابت یا خطاء دلیل ظنی سے نہیں، حدیث متواتر اور سنت مشہورہ سے ثابت ہے، پھر اس پر اہل سنت کا اجماع ہو چکا ہے، مجتہدین کے اختلافات میں ایک کی اصابت اور دوسرے کی خطاء کا احتمال اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کسی ایک صورت پر اجماع نہ ہوا ہو، چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں علماء اختلاف کے بعد ایک بات پر اجماع کر چکے ہیں تو وہاں مخالف رائے کی غلطی بھی قطعی اور یقینی مانی جاتی ہے نہ کہ ظنی، چاہے وہ رائے کسی صحابی کی ہو، البتہ جو لوگ اجماع

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۰۵.

سے قبل اختلاف کی حالت میں گذر چکے ہوں گے ان پر بھی طعن جائز نہیں"۔ ①

قارئین محترم! جناب اسماعیل ریحان صاحب کے مندرجہ بالا دو اقتباسات کو بغور پڑھیں، ان کا خلاصہ یوں نکلتا ہے کہ:

۱۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پیش آنے والے اجتہادی مشاجرات یا اختلافات میں کسی کے درست (مصیب) اور کسی کے مخطی (غلطی پر) ہونے کا فیصلہ، صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والے بھی کر سکتے ہیں (یاد رہے! یہاں اسماعیل ریحان صاحب قطعی اور یقینی مصیب اور مخطی کے فیصلے کی بات کر رہے ہیں جیسا کہ دوسرے اقتباس میں وضاحت ہے)

۲۔ یہ فیصلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں قیامت تک کیے جا سکتے ہیں (کیونکہ یہ ارشادات تا قیامت کافی ہیں)

۳۔ اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادی مشاجرات میں ایک فریق کی اصابت اور دوسرے کی خطاء، متواتر اور مشہور احادیث سے ثابت ہے۔

۴۔ نیز اسماعیل ریحان صاحب کا دعوی ہے کہ اجتہادی اختلافات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک فریق کی اصابت اور دوسرے کی خطاء پر اجماع امت بھی ہو چکا ہے۔

۵۔ اسماعیل ریحان صاحب فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک فریق کی قطعی اصابت اور دوسرے کی قطعی خطاء پر اجماع ہونے سے پہلے جو لوگ گذر چکے

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۱۹.

ان پر طعن بھی درست نہیں۔

ہمارا تبصرہ:

کیا اسماعیل ریحان صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن" متواتر اور مشہور" احادیث کی بناء پر بعد والوں نے یہ فیصلے کیے، وہ متواتر اور مشہور احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے نہ تھیں اور وہ ان سے لاعلم تھے؟؟ یا وہ احادیث زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد دریافت ہوئیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تو متواتر اور مشہور نہ ہوئیں، پھر ان کے متواتر اور مشہور ہونے کا دعوی کیونکر درست ہے؟

اور اگر وہ تمام احادیث ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے تھیں (اور حقیقت بھی یہی ہے) اور ان احادیث کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کے مابین یہ مشاجرات ہوئے تو کیا ہم یہ کہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک فریق کو ان احادیث کا مفہوم سمجھ نہ آیا، جو کہ بعد والے غیر صحابہ کو سمجھ آ گیا؟

بلکہ اسماعیل ریحان صاحب نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ صحابی رسول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے" حدیث قتل عمار" کا" اصل مطلب" نظر انداز کیا①۔ پھر لکھا ہے کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی توجیہ درحقیقت درست نہیں تھی"۔②

یاد رہے! سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو" فقیہ" فرما کر اِن کا شمار" فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم" میں کیا ہے۔③

یا اگر کوئی دشمن صحابہ یوں کہے کہ:" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ نے

---

①② دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۳۳، ۲۳۴.

③ صحیح البخاری، روایت نمبر: ۳۷۶۵ .

احادیث متواترہ ومشہورہ کا علم رکھتے ہوئے اوران احادیث کا مفہوم ومراد واضح ہوتے ہوئے جان بوجھ کران" نصوص" متواترہ ومشہورہ کے خلاف کیا لہٰذا وہ مجتہد نہیں ہوسکتے، کیا جانتے بوجھتے ہوئے کسی نص" متواتر" کی مخالفت کرنا یہ اجتہاد ہوتا ہے؟ اور کیا " نصوص متواترہ" کی جان بوجھ کر مخالفت کرنے والے کو بھی " مجتہد مخطی" بتا کر ایک اجر دیے جانے کا قول کیا جا سکتا ہے؟ تو ایسے شخص کو کیا جواب دیا جائے گا؟، ذرا اس پر بھی غور کرلیا جائے۔

یاد رہے! خلیفہ راشد ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہونے والے زمانہ مشاجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صرف دو فریق نہ تھے، بلکہ ایک بڑا فریق وہ تھا جو غیر جانبدار رہا اور اس نے دونوں جنگوں (جمل وصفین) میں متحارب فریقوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہ دیا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے بھی الگ رہے تھے (اس پر چند حوالے آگے آرہے ہیں)، تو کیا ان غیر جانبدار گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ان متواتر اور مشہور احادیث کا علم تھا یا نہیں؟

یہ بات اسماعیل ریحان صاحب بھی مانتے ہیں کہ زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی ایک فریق کے قطعی مخطی اور دوسرے کے قطعی مصیب ہونے پر ہرگز اجماع نہیں ہوا تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لہٰذا اگر بالفرض اس پر کوئی اجماع ہوا بھی تو وہ بعد کے قرون میں ہوا ہوگا، تو کیا ایسا کوئی اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر لاگو ہوسکتا ہے؟

اسماعیل ریحان صاحب نے " اجماع" کی تعریف بیان نہیں کی تاکہ ہم اس کی روشنی میں دیکھ سکیں کہ کیا واقعی اہل سنت کا اس پر اجماع کبھی ہوا ہے؟؟ سر دست ہم یہاں چند علماء اہل سنت کے حوالے پیش کرتے ہیں:

علامہ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۵۶ ہجری) لکھتے ہیں:

الْكَلَام فِي حَرْب عَليّ من حاربه من الصَّحَابَة رضی اللہ عنہم (قَالَ أَبُو مُحَمَّد) اخْتلف النَّاس فِي تِلْك الْحَرْب على ثَلَاث فرق فَقَالَ جَمِيع الشِّيعَة وَبَعض المرجئة وَجُمْهُور الْمُعْتَزلَة وَبَعض أهل السّنة أَن عليا كَانَ الْمُصِيب فِي حربه وكل من خَالفه على خطأ وَقَالَ وَاصل بن عَطاء وَعَمْرو بن عبيد وَأَبُو الْهُذَيْل وَطَوَائِف من الْمُعْتَزلَة أَن عليا مصيبا فِي قِتَاله مَعَ مُعَاوِيَة وَأهل النَّهر ووقفوا فِي قِتَاله مَعَ أهل الْجمل وَقَالُوا إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ مخطئة وَلَا نَعْرِف أَيهمَا هِيَ وَقَالَت الْخَوَارِج عَليّ الْمُصِيب فِي قِتَاله أهل الْجمل وَأهل صفّين وَهُوَ مخطيء فِي قِتَاله أهل النَّهر وَذهب سعد بن أبي وَقاص وَعبدالله بن عمر وَجُمْهُور الصَّحَابَة إِلَى الْوُقُوف فِي عَليّ وَأهل الْجمل وَأهل صفّين وَبِه يَقُول جُمْهُور أهل السّنة وَأَبُوبكر بن كيسَان وَذهب جمَاعَة من الصَّحَابَة وَخيَار التَّابِعين وَطَوَائِف مِمَّن بعدهمْ إِلَى تصويب محاربي عَليّ من أَصْحَاب الْجمل وَأَصْحَاب صفّين وهم الْحَاضِرُونَ لقتاله فِي الْيَوْمَيْنِ الْمَذْكُورين وَقد أَشَارَ إِلَى هَذَا أَيضا أَبُو بكر بن كيسَان..."①

ترجمہ: سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں اس بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور ان کے تین

① الفصل في الملل والنحل، جلد ۴ صفحہ ۱۱۹۔۱۲۰، مکتبۃ الخانجی، مصر.

(بڑے) گروہ ہیں۔

تمام شیعہ، بعض مرجئہ، جمہور معتزلہ اور بعض اہل سنت کہتے ہیں کہ سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) ان جنگوں میں درست تھے اور وہ تمام لوگ جو آپ کے مد مقابل تھے وہ غلطی پر تھے، (پھر اس گروہ میں سے) واصل بن عطاء، عمرو بن عبید، ابو الہذیل اور معتزلہ کے بہت سے گروہ کہتے ہیں کہ جہاں تک سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور اہل نہر کے ساتھ جنگ کا تعلق ہے تو ان میں سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) درست تھے (اور دوسرے غلط تھے) لیکن آپ کی جو جنگ اہل جمل (سیدنا عائشہ وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ) ہوئی اس میں ایک گروہ صحیح اور دوسرا غلط تھا لیکن کون صحیح اور کون غلط تھا؟ یہ ہم نہیں جانتے، لہٰذا ہم اس بارے توقف کرتے ہیں، اور خوارج کہتے ہیں کہ جنگ جمل وصفین میں سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) ہی حق پر اور درست تھے، لیکن اہل نہر کے ساتھ جنگ میں وہ غلط تھے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عبداللہ بن عمر اور جمہور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا موقف ہے کہ ہم جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں کے بارے میں توقف کرتے ہیں (یعنی ہم یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط۔ ناقل) اور جمہور اہل سنت اور ابو بکر بن کیسان کا یہی مسلک ہے۔

جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور خیار تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد بہت سے لوگوں کا یہ مسلک ہے کہ جمل اور صفین دونوں جنگوں میں سیدنا علی

(رضی اللہ عنہ) کے مدمقابل حضرات "مصیب" یعنی صحیح موقف پر تھے، اور یہ لوگ (یعنی جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ یہ موقف رکھتے ہیں۔ ناقل) ان دونوں جنگوں میں شریک تھے، اس بات کی طرف بھی ابوبکر بن کیسان نے اشارہ کیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں! ابن حزم رحمہ اللہ بھی "جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم" اور اور "جمہور اہل سنت" کا مسلک یہی بیان کر رہے ہیں کہ ہم جنگ جمل و جنگ صفین کے بارے میں توقف کرتے ہیں اور فریقین میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط...

نوٹ: اگرچہ آگے علامہ ابن حزم نے ان تمام گروہوں کے مسالک پر اپنا تبصرہ کیا ہے اور اپنی رائے بھی دی ہے جس کی تفصیل اسی کتاب میں آگے دیکھی جا سکتی ہے، لیکن سر دست ہم یہاں سر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ابن حزم نے "جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم" اور "جمہور اہل سنت" کا مسلک کیا بیان کیا ہے، نیز انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "صحابہ رضی اللہ عنہم اور خیار تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اور ان کے بعد بہت سے لوگوں کا یہ مسلک بھی ہے کہ جمل اور صفین دونوں جنگوں میں سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کے مدمقابل حضرات "مصیب" یعنی صحیح موقف پر تھے"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فَلَا رَيْبَ أَنَّهُ اقْتَتَلَ الْعَسْكَرَانِ: عَسْكَرُ عَلِيٍّ وَمُعَاوِيَةَ بِصِفِّينَ، وَلَمْ يَكُنْ مُعَاوِيَةُ مِمَّنْ يَخْتَارُ الْحَرْبَ ابْتِدَاءً، بَلْ كَانَ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ حِرْصًا عَلَى أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ غَيْرُهُ أَحْرَصَ عَلَى الْقِتَالِ مِنْهُ. وَقِتَالُ صِفِّينَ لِلنَّاسِ فِيهِ

أَقْوَالٌ: فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: كِلَاهُمَا كَانَ مُجْتَهِدًا مُصِيبًا، كَمَا يَقُولُ ذَلِكَ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيثِ، مِمَّنْ يَقُولُ: كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ، وَيَقُولُ: كَانَا مُجْتَهِدَيْنِ. وَهَذَا قَوْلُ كَثِيرٍ مِنَ الْأَشْعَرِيَّةِ وَالْكَرَّامِيَّةِ وَالْفُقَهَاءِ وَغَيْرِهِمْ، وَهُوَ قَوْلُ طَائِفَةٍ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ وَغَيْرِهِمْ، وَتَقُولُ الْكَرَّامِيَّةُ: كِلَاهُمَا إِمَامٌ مُصِيبٌ، وَيَجُوزُ نَصْبُ إِمَامَيْنِ لِلْحَاجَةِ.

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: بَلِ الْمُصِيبُ أَحَدُهُمَا لَا بِعَيْنِهِ، وَهَذَا قَوْلُ طَائِفَةٍ مِنْهُمْ.

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: عَلِيٌّ هُوَ الْمُصِيبُ وَحْدَهُ، وَمُعَاوِيَةُ مُجْتَهِدٌ مُخْطِئٌ، كَمَا يَقُولُ ذَلِكَ طَوَائِفُ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفُقَهَاءِ أَهْلِ الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ. ①

"بلا شک صفین میں سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) اور سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے لشکروں کا ٹکراؤ ہوا، لیکن جنگ اختیار کرنے والے (یعنی ابتداء کرنے والے) سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) نہ تھے، بلکہ آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اس بات کے خواہاں تھے کہ جنگ نہ ہو، جبکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ یہ چاہتے تھے کہ جنگ ہو جائے۔ (لیکن بعض لوگ یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج میں ابتدا کی تھی۔ ناقل)

① منهاج السنة، صفحه ۴۴۷، جلد ۴، طبع السعودية .

(پھر ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ) اور صفین کی جنگ کے بارے میں لوگوں کے تین قول ہیں:

پہلا قول: ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ دونوں (یعنی سیدنا علی وسیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما) مجتہد مصیب تھے (یعنی اپنے اپنے اجتہاد میں ٹھیک تھے)، یہ قول متکلمین وفقہاء ومحدثین میں سے بہت سے لوگوں کا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہی ہوتا ہے، اور کہتے ہیں کہ (چونکہ) وہ دونوں ہی مجتہد تھے (اس لیے دونوں مصیب تھے)، یہی قول ہے اشعریہ، کرامیہ اور فقہاء میں سے بہت سوں کا اور ان کے علاوہ دوسروں کا، نیز یہی قول ہے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا۔

دوسرا قول: کچھ یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی "مجتہد مصیب" تھے، لیکن کون تھے؟ اس کی تعیین نہیں کر سکتے، یہ بھی ان میں ہی ایک جماعت کا قول ہے۔

تیسرا قول: ان میں وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) ہی مصیب تھے اور سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) مجتہد مخطی تھے، جیسے کہ متکلمین اور چاروں مذاہب کے فقہاء کی کئی جماعتوں کا قول ہے۔

تو ملاحظہ فرمائیں، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس بارے میں تین اقوال ذکر فرمائے ہیں، اور تینوں ہی اہل سنت کے اقوال بتائے ہیں، لہٰذا یہ رٹ لگانا کہ اہل سنت کا صرف اس پر اجماع ہے کہ ان دونوں مجتہد صحابیوں میں سے صرف ایک مصیب تھے اور دوسرے غلط، اور مصیب یقینی طور پر سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) تھے اور سیدنا

معاویہ (رضی اللہ عنہ) یقینی طور پر غلط تھے... یہ دعوی غلط ہے.. بلکہ یہ تین اقوال میں سے صرف ایک قول ہے۔

یہی امام تیمیہ (رحمہ اللہ) اسی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

أَنَّ النَّبِيَّ - ﷺ - أَخْبَرَ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ مَسْلَمَةَ لَا تَضُرُّهُ الْفِتْنَةُ، وَهُوَ مِمَّنِ اعْتَزَلَ فِي الْقِتَالِ فَلَمْ يُقَاتِلْ لَا مَعَ عَلِيٍّ وَلَا مَعَ مُعَاوِيَةَ، كَمَا اعْتَزَلَ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ، وَأُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ، وَأَبُو بَكْرَةَ، وَعِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ، وَأَكْثَرُ السَّابِقِينَ الْأَوَّلِينَ.وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ هُنَاكَ قِتَالٌ وَاجِبٌ وَلَا مُسْتَحَبٌّ، إِذْ لَوْ كَانَ كَذَلِكَ لَمْ يَكُنْ تَرْكُ ذَلِكَ مِمَّا يُمْدَحُ بِهِ الرَّجُلُ، بَلْ كَانَ مَنْ فَعَلَ الْوَاجِبَ أَوِ الْمُسْتَحَبَّ أَفْضَلَ مِمَّنْ تَرَكَهُ، وَدَلَّ ذَلِكَ عَلَى أَنَّ الْقِتَالَ قِتَالُ فِتْنَةٍ.

كَمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ عَنِ النَّبِيِّ - ﷺ - أَنَّهُ قَالَ: " سَتَكُونُ فِتْنَةٌ الْقَاعِدُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ، وَالْقَائِمُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي، وَالْمَاشِي خَيْرٌ مِنَ السَّاعِي، وَالسَّاعِي خَيْرٌ مِنَ الْمُوضِعِ "، وَأَمْثَالُ ذَلِكَ مِنَ الْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ الَّتِي تُبَيِّنُ أَنَّ تَرْكَ الْقِتَالِ كَانَ خَيْرًا مِنْ فِعْلِهِ مِنَ الْجَانِبَيْنِ، وَعَلَى هَذَا جُمْهُورُ أَئِمَّةِ أَهْلِ الْحَدِيثِ وَالسُّنَّةِ، وَهَذَا مَذْهَبُ مَالِكٍ، وَالثَّوْرِيِّ وَأَحْمَدَ وَغَيْرِهِمْ.

" رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی کہ محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کو فتنہ نقصان نہیں پہنچائے گا، پس یہ (صحابی) محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) اس لڑائی میں ایک طرف ہو رہے، نہ انہوں نے سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی طرف سے لڑائی میں حصہ لیا اور نہ ہی سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی طرف سے، اسی طرح سیدنا سعد بن ابی وقاص، اسامۃ بن زید، عبداللہ بن عمر، ابوبکرہ، عمران بن حصین، اور اکثر سابقون أوّلون (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اس موقع پر الگ ہی رہے (یعنی دونوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہاں جنگ نہ واجب تھی اور نہ ہی مستحب، کیونکہ اگر اس جنگ میں حصہ لینا واجب یا مستحب ہوتا تو اس کو چھوڑنے (اور الگ رہنے پر) آدمی کی تعریف نہ کی جاتی (اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جو سیدنا محمد بن مسلمہ کے بارے میں گزری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا محمد بن مسلمہ کے اس قتالِ فتنہ سے الگ رہنے کو بطور تعریف ذکر فرمایا۔ ناقل) بلکہ کسی واجب یا پسندیدہ چیز کا کرنا بنسبت اس کے چھوڑنے کے افضل ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ لڑائی (یعنی جنگ صفین) قتالِ فتنہ تھی...

اسی طرح صحیح میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: عنقریب ایک فتنہ بپا ہوگا، اس دوران (اپنی جگہ پر) بیٹھا رہنے والا، کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، اور اپنی جگہ پر کھڑا رہنے والا، چلنے سے والے سے بہتر ہوگا، اور چلنے والا بھاگنے والے سے بہتر ہوگا، اور بھاگنے والا اس فتنہ میں پڑنے والے سے بہتر ہوگا.. اسی طرح کی

اور بھی بہت سی صحیح احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دونوں طرف سے جنگ اور لڑائی کا ترک کرنا ہی افضل تھا، یہی جمہور محدثین اور اہل سنت کا کہنا ہے، اور یہی امام مالک، امام ثوری اور امام احمد وغیرھم کا مذہب ہے۔ ①

نوٹ: اس عبارت میں حافظ ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) صراحت کے ساتھ ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف کو ترجیح دے رہے ہیں جو ان باہمی جنگوں اور قتال فتنہ سے الگ رہے اور کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا... اور یہ ترجیح بہت سی صحیح احادیث کی بنیاد پر دے رہے ہیں، نیز انہوں نے ان بعض جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام بھی لکھے ہیں جو غیر جانبدار رہے۔

پھر ایک جگہ چند اقوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَيُقَالُ: حَادِي عَشَرَ قَوْلُكُمْ: " بَايَعَهُ الْكُلُّ بَعْدَ عُثْمَانَ". مِنْ أَظْهَرِ الْكَذِبِ، فَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ: إِمَّا النِّصْفُ، وَإِمَّا أَقَلُّ أَوْ أَكْثَرُ لَمْ يُبَايِعُوهُ، وَلَمْ يُبَايِعْهُ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ وَلَا ابْنُ عُمَرَ وَلَا غَيْرُهُمَا. ②

" اور جو گیارہویں بات یہ کہی جاتی ہے کہ: سیدنا عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بعد سب نے ان (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی تھی۔ تو یہ بات صاف جھوٹ ہے، کیونکہ بہت سے مسلمانوں نے، آدھوں نے یا اس سے ذرا کم یا اس سے زیادہ نے (یعنی تقریباً آدھوں نے) ان کی بیعت نہیں

① منهاج السنة، صفحه ۵۴۱۔۵۴۲، جلد ۱، طبع سعودیه .
② حواله مذکوره، صفحه ۵۱۵۔۵۱۶ جلد ۴، طبع سعودیه .

کی تھی، سعد بن ابی وقاص نے نہیں کی تھی، ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نہیں کی تھی۔

نوٹ: امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) سے بڑا قاطع رافضیت شاید ہی کوئی ہوا ہے، اور وہ فرما رہے ہیں کہ اس وقت موجود مسلمانوں کی آدھی کے قریب تعداد نے سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی تھی، اور پہلے انہی کی بات گذری کہ سابقون اولون میں اکثر لوگوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی۔

ایک اور جگہ یہی امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) لکھتے ہیں:

فَإِنَّ ثُلُثَ الْأُمَّةِ - أَوْ أَقَلَّ أَوْ أَكْثَرَ - لَمْ يُبَايِعُوا عَلِيًّا، بَلْ قَاتَلُوهُ وَالثُّلُثَ الْآخَرَ لَمْ يُقَاتِلُوا مَعَهُ وَفِيهِمْ مَنْ لَمْ يُبَايِعْهُ أَيْضًا، وَالَّذِينَ لَمْ يُبَايِعُوهُ مِنْهُمْ مَنْ قَاتَلَهُمْ، وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يُقَاتِلْهُمْ...

بے شک امت کے ایک تہائی یا کم یا زیادہ لوگوں نے سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی تھی، بلکہ ان کے ساتھ جنگ بھی کی، اور دوسرے ایک تہائی نے ان کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہ لیا پھر ان (ان کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہ لینے والوں میں) ایسے بھی تھے جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، اور پھر جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے ساتھ انہوں نے قتال کیا اور ایسے بھی تھے جس کے ساتھ قتال نہیں کیا۔ ①

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے صلح حسن ومعاویہ (رضی اللہ عنہما) کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلح کے ماحول کے متعلق .. هدنة على

① منهاج السنة، صفحه ۳۳۸، جلد ۸، طبع سعودیه .

دَخَن..(ناگواری کے ساتھ صلح) فرمایا، اس ارشاد نبوی کے مطابق یہ صلح خیر اور ناگواری دونوں پہلو لئے ہوئے تھی.....اور امت کی بڑی تعداد کو پہنچنے والے طبعی رنج کی وجہ سے حدیث میں اسے .. جماعة علی اَقذاء.. (کدورت کے ساتھ اجتماعیت) سے بھی تعبیر کیا گیا" ①۔

اور جب ہم نے یہ سوال کیا کہ ان احادیث میں ہرگز نبی کریم ﷺ نے اس صلح کی طرف اشارہ تک نہیں فرمایا، اور اس بات کو اسماعیل ریحان صاحب کا صریح طور پر نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا محل نظر اور غیر محتاط عمل ہے، تو ہمیں جواب دیا گیا کہ یہ بات حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھی ہے انہی سے اسماعیل ریحان صاحب نے نقل کی ہے، اگر اعتراض کرنا ہے تو حافظ ابن تیمیہ پر کرو۔

لہٰذا ہم نے بھی جو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب سے اوپر طویل اقتباسات نقل کیے ہیں، وہ اور کسی کے لیے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں، اسماعیل ریحان صاحب کے لیے انہیں رد کرنے کی گنجائش نہیں۔

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القُرطبی (م ۶۷۱ھ) لکھتے ہیں

"لَا يَجُوزُ أَنْ يُنْسَبَ إِلَى أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ خَطَأٌ مَقْطُوعٌ بِهِ، إِذْ كَانُوا كُلُّهُمُ اجْتَهَدُوا فِيمَا فَعَلُوهُ وَأَرَادُوا اللهَ عَزَّ وَجَلَّ، وَهُمْ كُلُّهُمْ لَنَا أَئِمَّةٌ" ②

کسی صحابی کی طرف قطعی طور پر غلطی کی نسبت کرنا جائز نہیں کیونکہ ان سب نے جو کیا وہ اس میں مجتہد تھے اور ان کا ارادہ اللہ کی رضا تھی، وہ

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۶.

② الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، ج ۱۹، ص ۳۸۲ و ۳۸۳، مؤسسة الرسالة .

سب ہمارے امام ہیں۔

اور سیدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

"اے برادر! اس معاملہ میں (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے میں) امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) تنہا نہیں ہیں، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کم وبیش نصف جماعت اس معاملہ میں سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کہ شریک ہیں۔ ①

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاؤن کراچی کے مفتی عبدالسلام چاٹگامی نے اس استفتاء کا تفصیلی تحریر فرمایا، جس کے آخر میں لکھا کہ:

"اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت قطعی طور پر حق پر تھی اور دوسری جماعت قطعی طور پر ناحق پر تھی، اس کی کوئی دلیل قطعی قرآن میں نہیں ہے، ہاں ظن وگمان کے درجہ میں بعض کو صواب پر اور بعض کو خطا پر سمجھنا ممکن اور جائز ہے، لازم نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک تیسری جماعت ایسی بھی تھی جس نے ان میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ یہ حضرات خاموشی کو اسلم سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنص قطعی اسلام اور مسلمانوں کے سراپا خیر خواہ تھے، اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تھی، پھر یہ حضرات قطعی باغی اور خطا کار کیسے ہو سکتے ہیں؟۔ بناء علیہ ہمارے نزدیک دونوں تحریرات میں سے جناب طارق صاحب کی تحریرات اقرب الی الحق واولی بالصواب واثبت بالاخذ واقوی بالدلیل وانسب للتعبیر واوفق بالمذاھب ہیں اور جناب خالد

① مکتوبات امام ربانی، اردو، دفتر اول، مکتوب نمبر: ۲۵۱، طبع ادارہ مجددیہ کراچی۔

صاحب کی تحریرات اس کے برعکس ہیں، مبنی برخطا اور اقرب الی الخطا ہیں واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم". ①

مکمل استفتاء اور اس کا جواب ماہنامہ بینات کے مندرجہ بالا شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے، نیز اصل ہاتھ سے لکھا ہوا فتوی بھی میرے پاس محفوظ ہے جو لکھا ہوا مفتی محمد عبدالسلام صاحب چاٹگامی صاحب کا ہے اور اس پر ان کے علاوہ مزید ۷ مفتیان کرام کے تائیدہ دستخط موجود ہیں۔

نوٹ: نیز اسی استفتاء کے جواب میں" دارالعلوم کراچی" سے بھی مورخہ ۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۳ ہجری مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ کو ایک تفصیلی فتویٰ جاری کیا گیا، جس کے آخر میں صاف طور پر لکھا ہے کہ:

" مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں احوط واسلم راستہ وہی ہے جس کو طارق نے اختیار کیا ہے، اہل سنت والجماعت کے تمام افراد کو یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے" (اور بنوری ٹاؤن کے فتوے میں بھی طارق کے ہی موقف کو اقرب الی الحق واولی بالصواب لکھا گیا ہے)۔

دارالعلوم کراچی کا یہ فتویٰ لکھا" محمد حنیف خالد شورکوٹی صاحب" نے، اور اس پر" مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب حفظہ اللہ" کے" الجواب صحیح" کی عبارت کے ساتھ تائیدی دستخط ثبت ہیں۔

اسی طرح" دارالعلوم دیوبند" کو بھی یہی استفتاء ارسال کیا گیا تھا، اور اس کے جواب میں دارالعلوم دیوبند کے" مفتی نظام الدین صاحب" نے لکھا کہ: " احقر کے نزدیک احتیاط طارق کے قول میں معلوم ہوتی ہے"، اس فتوے پر مفتی

① ماہنامہ" بینات" بابت ماہ ربیع الاول ۱۴۱۳ ہجری، ستمبر ۱۹۹۲ء، صفحات ۲۹۔۳۸.

حبیب الرحمٰن صاحب کے تائیدی دستخط بھی موجود ہیں اور دار العلوم دیو بند کی خاص مہر بھی ثبت ہے، تاریخ ۲۱ / ۱۲ / ۱۴۱۲ ہجری لکھی ہے۔

(یہ تمام اصل فتاویٰ میرے پاس محفوظ ہیں)

تو اگر اسماعیل ریحان صاحب والی "اجماع" والی بات تسلیم کر لی جائے تو کیا ان تمام علماء اہل سنت کو اس اجماع کا علم نہ ہو سکا، جو وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والوں میں بھی مختلف آراء کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بارے میں اہل سنت کا اولیٰ الی الحق اور احوط مسلک "توقف وسکوت" بتا رہے ہیں؟؟ نہ کہ ایک فریق کو قطعی مصیب اور دوسرے کو قطعی مخطی بتانے اور ثابت کرنے پر ہی ادھار کھائے بیٹھنا۔

آخر میں سیدنا مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا ایک حوالہ اجتہاد اور اجماع کے بارے میں غور سے پڑھیں، لکھتے ہیں:

> "دوسری بات یہ کہ مجتہد ائمہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرنے پر حکم دیے گئے ہیں، ان کے لیے دوسرے اماموں کی پیروی درست نہیں ہے، ورنہ اس سے بھی کیا کم کہ دوسروں کی پیروی ضروری نہیں ہے، تیسری بات یہ کہ اجماع کی حقیقت یہ ہے کہ ایک دو یا زیادہ کے تمام اہل رائے کسی معاملے میں اس طرح رائے دیں کہ یہ امر فلاں دلائل کی بناء پر اِس طرح یا اُس طرح ہے، صرف مخالفت نہ کرنا اجماع نہیں کہلا سکتا"۔ ①

نوٹ: حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنے اس مکتوب کا عنوان وہ نہیں لکھا جو

---

① مکتوب حضرت نانوتوی شائع کردہ بعنوان "در تحقیق واثبات شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ وکردارِ یزید"، صفحہ ۴۷، شائع کنندہ: تحریک خدام اہل سنت، لاہور۔

اسے الگ سے شائع کرنے والوں نے تحریف کر کے لکھا ہے، اسماعیل ریحان صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ایک جگہ اسی عنوان" شہادت امام حسین وکردار یزید" کو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا " نایاب رسالہ" لکھا ہے۔① ، جبکہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا اس عنوان سے کوئی رسالہ یا مکتوب نہیں، بلکہ اس مکتوب کا نام ہے " در تحقیق واثبات شہادت امام حسین مطابق قواعد سنیاں" ۔②

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۳۷ حاشیہ.

② دیکھیں: قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم، صفحہ ۱۵۱.

اسماعیل ریحان صاحب، اپنے ہی اصولوں کا خون کرتے ہیں

قارئین محترم! جیسا کہ گذشتہ قسط میں بیان ہوا کہ، جناب اسماعیل ریحان صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اجتہادی مشاجرات میں قطعی طور پر "مصیب" اور "مخطی" کا فیصلہ بعد کے زمانوں والے کر سکتے ہیں، اور چونکہ بعد والوں کا (بقول اسماعیل ریحان صاحب) احادیث متواترہ ومشہورہ کی بناء پر اس بات پر اجماع ہوگیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فلاں فریق یقینی طور پر" خطاء پر" اور فلاں فریق" صواب پر" تھا، لہٰذا اب اسی اجماع کو بنیاد بنا کر یہ فیصلے کرنا بالکل درست ہے۔ (ملخصاً)

قارئین محترم! آیئے اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اسماعیل ریحان صاحب، اپنا یہ اصول" واقعہ حرہ" میں بھول جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں، ان کے چند اقتباسات:

"..یہ طے ہے کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے مطابق ظالم و فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھنا شرعاً درست نہ تھا.." ①

اور یہی مسلک اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور جمہور فقہاء کا لکھا ہے۔ ②

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۵۰.

② حوالہ مذکورہ ص ۶۷۲.

اور لکھا کہ:

" اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمران کے ذاتی فسق کی وجہ سے خروج جائز نہیں ہوتا" ۔ ①

اور

" جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے نزدیک خروج کا جواز یا وجوب کفر بوّاح (کھلم کھلا کفر) کے ارتکاب پر ہوا کرتا ہے" ۔ ②

اور

"... دوسری صدی ہجری کے دوران اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہو گیا (جسے دوسرے لفظوں میں اجماع کہا جاتا ہے۔ ناقل) کہ حکام کے ظلم وستم پر صبر وتحمل کرنا اور خروج نہ کرنا واجب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کو بدلتا دیکھ کر فقہاء نے اپنے طور پر دین میں تبدیلی کر لی تھی اور یہ نئے احکام ایجاد کر لیے، ہرگز نہیں بلکہ یہ ہدایات قرآن وسنت کی نصوص میں پہلے سے موجود تھیں... الخ" ③

اور

" صرف معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں" ۔ ④

اور لکھا کہ:

" ارشادات نبویہ کی بناء پر جمہور امت کا مسلک شروع سے یہ رہا ہے

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۲۵۳.

③ حوالہ مذکورہ ص ۶۱۔ ۶۲.

④ حوالہ مذکورہ ص ۶۳.

کہ حکمران چاہے فاسق و فاجر ہو مگر جب تک کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے"۔ ①

قارئین محترم! ان تمام اقتباسات سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ دوسری صدی ہجری کے دوران اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ حکام کے ظلم وستم پر صبر کرنا اور ان کے خلاف خروج نہ کرنا واجب ہے۔

۲۔ فقہاء نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں ایجاد کی، بلکہ یہ ہدایات پہلے سے قرآن وسنت کی نصوص میں موجود تھیں، یعنی اہل سنت والجماعت کا یہ اتفاق واجماع قرآن وسنت کی نصوص کی بنیاد پر ہوا۔

۳۔ ارشادات نبویہ کی بناء پر جمہور امت کا مسلک یہ ہے کہ حکمران چاہے فاسق و فاجر ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے، جب تک حکم کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو۔

۴۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمران کے ذاتی فسق کی وجہ سے خروج جائز نہیں ہوتا۔

۵۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے مطابق بھی ظالم و فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھنا شرعاً درست نہ تھا، جب تک کہ حکمران کھلم کھلا کفر (کفر بوّاح) کا مرتکب نہ ہو۔

۶۔ جمہور امت کا مسلک شروع سے یہ رہا ہے کہ حکمران چاہے فاسق و فاجر ہو مگر جب تک کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے۔

۷۔ صرف معتزلہ اور خوارج کا مسلک یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۰.

قارئین محترم! سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا بیٹا "یزید" خلافت پر متمکن ہوا، اور آخر کار اس کی حکومت پوری طرح قائم ہوگئی، محرم سنہ ۶۱ ہجری میں ہونے والے سانحۂ کربلاء کے بعد کہیں سے حکومت کے خلاف کوئی شورش یا خروج یا تحریک ہمیں نظر نہیں آتی، یہاں تک کہ سنہ ۶۳ ہجری میں واقعہ حرہ ہوتا ہے، اور ہوا یہ کہ مدینہ کے کچھ لوگ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (یہاں ہم اس واقعہ کی تفاصیل واسباب ووجوہ پر بات نہیں کر رہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟) اور بقول اسماعیل ریحان صاحب:

> "اکابر مدینہ نے طے کیا کہ وہ حکومت کو خلافت راشدہ کے دور کی طرح مہاجرین و انصار کی رضامندی اور شورائیت کے اصول پر چلائیں گے نہ کہ موروثی نظام پر، اہل مدینہ نے ایک شہری حکومت ترتیب دی.....ان حضرات نے شہر کا انتظام سنبھال کر یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان اور بنو امیہ کے دیگر افراد کو مدینہ منورہ سے نکال دیا....." ①

نوٹ: ابھی ہم اس پر بھی بات نہیں کریں گے کہ کیا یہ فیصلہ "اکابر مدینہ" کا تھا یا "اصاغر مدینہ" کا اور کیا یہ "بعض اہل مدینہ" کا فیصلہ تھا یا "تمام اہل مدینہ کا"، کیونکہ ابھی یہ موضوع زیر بحث نہیں۔

بہرحال اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک بھی یزید "کافر" نہیں تھا، بلکہ وہ بھی اسے فاسق ہی بتاتے ہیں، تو اصولاً یہ ہونا چاہیے تھا کہ چونکہ بعد میں اہل سنت والجماعت کا نصوص قرآنیہ وحدیثیہ کی بناء پر اس بات پر اتفاق ہو چکا کہ

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۲.

حکمران کے فسق کی وجہ سے اس کے خلاف خروج جائز نہیں، اور جس وقت واقعہ حرہ ہوا، اس وقت بھی جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک تھا، تو پھر اگر کوئی اسے بنیاد بنا کر اس واقعہ میں یزید کہ خلاف خروج کرنے والوں کو "قطعی طور پر مخطی" کہے تو اسماعیل ریحان صاحب کو اس پر اصولاً کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، لیکن یہاں وہ ایسا برداشت نہیں کریں گے، بلکہ انہوں نے کچھ اس طرح سے یہاں تاویل کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

"تاہم معقل بن سنان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر مدینہ بھی اپنی جگہ دلائل رکھتے تھے، ان کے اجتہاد کے مطابق حکمران ذاتی فسق کی وجہ سے معزول کر دیے جانے کے لائق ہوتا تھا اور اس کے خلاف خروج واجب ہو جاتا تھا"۔ ①

اور یہیں حاشیہ میں لکھا:

"بعد میں بھی علماء کا ایک طبقہ فاسق حکمران کے خلاف خروج کو جائز اور ایک طبقہ اسے واجب کہتا آیا ہے"۔ ②

غور فرمائیں! پہلے بتا آئے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں فاسق حکمران کے خلاف خروج کے عدم جواز پر نصوص قرآنیہ وحدیثیہ کی بناء پر اتفاق ہو چکا تھا، اور اس کے خلاف خروج کے وجوب کا مسلک صرف معتزلہ اور خوارج کا ہے، لیکن اب یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ:

"بعد میں بھی (یعنی واقعہ حرہ کے بعد کے زمانوں میں) علماء کا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۱۱۔ ۵۱۲.
② حاشیہ صفحہ ۵۱۲.

ایک طبقہ فاسق حکمران کے خلاف خروج کو جائز اور ایک طبقہ اسے واجب کہتا آیا ہے"۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسا کوئی علماء کا طبقہ واقعی پایا جاتا ہے تو اس کی یہ رائے" اہل سنت والجماعت کے اتفاقی عقیدہ" کے خلاف ہے یا نہیں؟؟ اس کی یہ بات جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے خلاف ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر اسماعیل ریحان صاحب کو یہ بات نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟؟ وہ اہل سنت کے اتفاقی عقیدہ کو ہی بیان کرتے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے، لیکن نہیں، وہ یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ بعد میں فاسق حکمران کے خلاف خروج کے عدم جواز پر اہل سنت کا اتفاق ہو چکا، اور یہ اتفاق بھی نصوص قرآنیہ وحدیثیہ کی بنیاد پر ہوا، اور اگرچہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی شروع سے یہی موقف تھا، لیکن چونکہ واقعہ حرہ میں حکومت کے خلاف تحریک چلانے والوں کے اجتہاد کے مطابق فاسق حکمران کے خلاف خروج واجب تھا اور یزید ان کے نزدیک فاسق ہو چکا تھا اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے اجتہاد کا احترام کریں اور انہیں قطعی "مخطی" نہ کہا جائے، اور اس بات کی مزید تاکید کے لیے وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ اس پر اہل سنت کا اتفاق بتا آئے ہیں، اور یہاں یہ لکھنے لگے کہ" بعد میں بھی علماء کا ایک طبقہ فاسق حکمران کے خلاف خروج کو جائز اور ایک طبقہ واجب کہتا آیا آیا ہے"۔ (یعنی ان علماء کی رائے کا احترام کرنے کا سبق دیا جا رہا ہے)

نیز ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ:

" حکومت کے خلاف یہ اقدام کرنے والوں کا مقصد خلافت راشدہ کے دور کی طرح مہاجرین وانصار کی رضامندی اور شورائیت کا نظام

واپس لانا تھا"۔

اب یہ الگ سوال ہے کہ ان حضرات کو یہ خیال اس وقت کیوں نہ آیا جس وقت یہ یزید کی خلافت کی بیعت کر رہے تھے؟؟ یا یہ خیال اس وقت کیوں نہ آیا جس وقت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا میں شہید کر دیا گیا؟ انہوں نے ۶۳ ہجری تک انتظار کیوں کیا؟؟ کیا رجب ۶۰ ہجری سے لے کر واقعہ حرہ تک خلافت راشدہ کے دور کی طرح شورائیت کا نظام تھا، اور بعد میں وہ "موروثی" بنا؟؟

اسماعیل ریحان صاحب کا کچھ ایسا ہی تضاد ہمیں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں "عبدالرحمٰن بن اشعث" کی بغاوت کا بیان کرتے ہوئے بھی نظر آتا ہے (واضح رہے کہ خود اسماعیل ریحان صاحب نے ابن اشعث کے اقدام کو "بغاوت" لکھا ہے، دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۴، جیسا کہ ہم پہلے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے)

لیکن اسکے باوجود وہ ان "باغیوں" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ دیر جماجم کے اکثر حریت پسند مخلص تھے، اللہ کے دین کو خالص خلافت راشدہ کے انداز میں نافذ کر کے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چاہتے تھے، ان شاء اللہ ان کے مقتولین کے ساتھ اللہ کے ہاں رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوا ہوگا"۔

اور آگے لکھا:

"ان کا یہ عمل بہادری و حمیت کے لحاظ سے قابل فخر ہے..... ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں"۔ ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۰.

خلاصہ کلام یہ کہ:

اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہادی اختلافات میں بعد والوں کے اتفاق و اجماع کی بنیاد پر نیز احادیث متواترہ ومشہورہ کی بنیاد پر کسی ایک فریق کے "قطعی مخطی" اور دوسرے کے "قطعی مصیب" ہونے کے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے تو پھر دوسرے اجتہادی اختلافات میں (جن کی ایک مثال ہم نے واقعہ حرہ کی پیش کی ہے) بعد والوں کے اتفاق و اجماع اور قرآنی وحدیثی نصوص اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مسلک کی بنیاد پر کسی فریق کے "قطعی مخطی" ہونے کا قول کیوں نہیں کیا جا سکتا؟؟

نیز کیا "ابن اشعث" اور اس کے "باغی" گروہ کے اقدام کو "قابل فخر کارنامہ" صرف اس لیے قرار دیا جا رہا ہے کہ اس کی بغاوت "بنوامیہ" کے خلاف تھی؟؟ اور کس اصول سے ان کی بغاوت جرم نہیں تھی؟؟

نوٹ: ہم نے یہ ساری تفصیل صرف اسماعیل ریحان صاحب کے تضاد کو واضح کرنے کے لیے بیان کی ہے، یہاں ہمارا مقصد واقعہ حرہ پر اپنی کسی قسم کی رائے دینا نہیں، اور نہ ہی ہم اس واقعہ میں بیعت توڑنے والوں پر کوئی فتویٰ لگا رہے ہیں، اس واقعہ کے اسباب وعوامل اور واقعات ایک الگ بحث ہے۔

''صلح حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہما'' کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کی حقیقت

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی صلح کا ذکر کرتے ہوئے اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے جذبۂ ایثار کی تحسین کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا: **ان ابني هذا سيد ولعل الله ان يصلح به بين طائفتين من المسلمين** (میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے اللہ تعالی اس کی بدولت مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے) وہاں اس صلح کے ماحول کے متعلق ..**هدنة على دَخَن**..(ناگواری کے ساتھ صلح) کی بھی وضاحت فرمادی، اس ارشاد نبوی کے مطابق یہ صلح خیر اور ناگواری دونوں پہلو لئے ہوئے تھی، خیر اس لئے تھی کہ اس کے باعث باہمی جنگ کے خطرات ختم ہو گئے تھے اور مسلمان سیاسی طور پر ایک بار پھر متحد ہو گئے، ناپسندیدہ پہلو جس کا محسوس ہونا فطری بات تھی، یہ تھا کہ خلافت اپنے بہترین حق دار سے سلب ہو گئی تھی، اسی پہلو اور امت کی بڑی تعداد کو پہنچنے والے طبعی رنج کی وجہ سے حدیث میں اسے .. **جماعة على أقذاء** ..(کدورت کے ساتھ اجتماعیت) سے بھی تعبیر کیا گیا"۔ ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۶.

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد نقل کیا ہے اس کا حوالہ حاشیہ میں صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۷۰۴ کا دیا ہے، اور صحیح بخاری میں عربی الفاظ یوں ہیں: "إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ" ، جبکہ اسماعیل ریحان صاحب نے "بین طائفتین من المسلمین" کے الفاظ نقل کیے ہیں، اب معلوم نہیں "مستند ترین تاریخ" بتائی جانے والی اس کتاب میں الفاظ کی یہ تبدیلی کسی خاص مقصد کے تحت کی گئی یا غلطی سے، اس بات کو ابھی ہم ایک طرف رکھتے ہیں۔

بہرحال! مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صلح سے جس کی بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پہلے دے دی تھی، اور جس صلح کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی تھی کہ اللہ یہ صلح کروائیں گے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعے، اسماعیل ریحان صاحب اس صلح سے بہت رنجیدہ ہیں، رہی بات اُس زمانہ کے مسلمانوں کی اکثریت کی خاص طور پر صحابہ وتابعین کی تو وہ تو اس صلح پر اتنے خوش تھے کہ انہوں نے اس سال کا نام ہی "عام الجماعۃ" رکھ دیا تھا، ہاں وہ لوگ ضرور رنجیدہ ہوئے جنہیں "سبائی" کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر کے امت میں جو فساد شروع کیا تھا وہ اس صلح سے اپنے اختتام کو پہنچا تھا، تو ان کا رنجیدہ ہونا بنتا تھا اور آج بھی وہ رنجیدہ لگتے ہیں۔

پھر آگے ایک جگہ اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے:

"جو شورائی خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نکل کر اہل شام کے پاس گئی تو بہت سے اکابر امت کو طبعی رنج ہوا، تاہم وہ خانہ جنگی اور

افتراق پر امن واتحاد کو ترجیح دیتے تھے اس لیے مصلحتاً سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو انہوں نے قبول بھی کرلیا"۔ ①

اسماعیل ریحان صاحب کے ان الفاظ پر غور کریں، وہ یہ بتا رہے ہیں کہ جس صلح کی بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہوئی تھی اور جس کی نسبت اللہ تعالی کی طرف فرمائی تھی، اور جو صلح "مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں (**فئتین عظیمتین من المسلمین**) " کے درمیان ہونی تھی، اس صلح سے (بقول اسماعیل ریحان صاحب) "اکابر امت" کو طبعی رنج ہوا لیکن وہ "مصلحتاً" خاموش رہے اور انہوں نے "مصلحتاً" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کیا، لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ "اکابرین امت" کون کون تھے جنہیں اس صلح پر "طبعی رنج" ہوا؟

دوسری بات جناب اسماعیل ریحان صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صلح کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ ناگواری کے ساتھ صلح ہوگی"، ہمارا سوال ہے کہ وہ حدیث پیش کی جائے جس میں سیدنا معاویہ وسیدنا حسن رضی اللہ عنہما کے درمیان صلح کا ذکر کرکے یہ فرمایا گیا ہو کہ یہ صلح ناگواری کے ساتھ ہوگی..... یاد رہے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان درکار ہے، کسی شارح یا کسی عالم کا خیال یا اپنا فہم نہیں... کیونکہ اسماعیل ریحان صاحب نے یہ بات صراحت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے جو کہ ایک بہت بڑی جسارت ہے۔

تیسری بات، جناب اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ "اس صلح کے نتیجے میں خلافت اپنے بہترین حق دار سے سلب ہوگئی تھی"، تو بتایا جائے کہ اس وقت

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۵۱.

" خلافت کا بہترین حق دار" کون تھا؟ نیز یہ خلافت" سلب کرنے والا" کون تھا؟ اور کس سے سلب کی گئی تھی؟؟ (سلب کرنے کا اردو میں معنی" چھیننا" ہے) اس وقت موجود صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل صحابی کون تھا؟ ظاہر ہے اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک اس وقت مرتبہ میں جو صحابی سب سے بڑھ کر ہوگا وہی خلافت کا بہترین حق دار ہوگا؟

چوتھی بات، اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو " شورائی خلافت" بتایا ہے، اور شورائی خلافت سے مراد ان کے نزدیک وہ خلافت ہے جو اہل حل وعقد کے اتفاق اور مرضی سے قائم ہو، لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ جن اہل حل وعقد نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا وہ کہاں کے تھے؟ مدینہ منورہ کے؟ یا عراق کے؟ یا کسی اور جگہ کے؟ نیز اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ:

> " جب شورائی خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نکل کر اہل شام کے پاس گئی..."

تو بتایا جائے کہ جو خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں" شورائی" تھی، جب وہی" شورائی خلافت" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ (جنہیں اسماعیل ریحان صاحب اپنی کتاب میں طنزاً" اہل شام" لکھتے ہیں) کو خود سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی سے منتقل کی (جس کا اقرار خود اسماعیل ریحان صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ:

> " سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اگرچہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی منظوری سے قائم ہوئی تھی"۔ ①

---

① ج ۲ ص ۸۵۱.

تو وہ خلافت ایک دم" شورائی" سے بدل کر" غیر شورائی" کیسے ہوگئی؟ کیا اسماعیل ریحان صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی اس منظوری سے اس وقت کے" اہل حل وعقد" متفق نہیں تھے اور یہ اکیلے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تھا؟، ہمیں تو اسماعیل ریحان صاحب کا یہی نظریہ لگتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

" سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ایک متوازی غیر آئینی حکومت تھی، دونوں حکومتوں کے سربراہوں کی خواہش تھی امت مسلمہ ایک خلیفہ پر متفق ہو جائے مگر ایسے میں امت مسلمہ کے نمائندہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ امت کے بہترین فرد کا انتخاب کرتے"۔ ①

یعنی بقول اسماعیل ریحان صاحب، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، دونوں نے خود ہی یہ فیصلہ کرلیا اور" اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم" کو اس فیصلے میں شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی انہیں یہ موقع دیا گیا کہ وہ امت کے بہترین فرد کا انتخاب کرتے۔

لیکن وہ پہلے یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

" اگرچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کسی جانشین کا تقرر کر کے نہیں گئے تھے، مگر ان کی شہادت کے بعد عالم اسلام میں ان کے صاحبزادے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے زیادہ برگزیدہ اور عالی نسب شخصیت اور کوئی نہ تھی"۔ ②

اگرچہ اسماعیل ریحان صاحب کی یہ بات بھی محل نظر ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے زیادہ برگزیدہ اور کوئی ہستی نہ تھی، نیز خلافت کی جانشینی میں" عالی نسبی" کا اہل سنت کے ہاں کوئی تصور نہیں، لیکن ہم یہاں اس نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ باقرار اسماعیل ریحان صاحب

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۵.

② حوالہ مذکورہ ص ۳۳۵.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کی سب سے زیادہ برگزیدہ ہستی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی منظوری سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہوئی تھی تو اس پر اسماعیل ریحان صاحب کیوں چیں بجبیں ہیں؟ کیا انہیں اس وقت کی عالم اسلام کی برگزیدہ ترین ہستی کے فیصلے پر کوئی اعتراض ہے؟

پھر اس عبارت کو غور سے پڑھیں، کیا اس میں یہ نہیں بتایا جا رہا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام میں سب سے زیادہ افضل اور برگزیدہ ہستی سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی تھی؟ اگر یہی بتایا جا رہا ہے تو پھر سوال ہے کہ:

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، سابقون اولون میں سے نہیں اور نہ ہی اصطلاحی مہاجرین میں سے ہیں، کیونکہ آپ کی ولادت ہی ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوئی تھی، اور جس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اس وقت سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ جیسی "مہاجر"، "بدری" "سابقون اولون" اور "عشرہ مبشرۃ میں شامل" شخصیت ابھی زندہ تھی (سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۵ ہجری میں ہوئی)، تو کیا سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، مرتبہ و مقام میں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تھے؟ (سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کا نام صرف بطور مثال ذکر کر رہا ہوں، ورنہ نام اور بھی ہیں)، کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ساری امت سے افضل اور برگزیدہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بتانا یہ شیعہ کے عقیدہ امامت کا لحاظ تو نہیں ہے کہ ان کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد اگلے امام سیدنا حسن رضی اللہ عنہ تھے؟، کیا یہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی شان میں غلوّ نہیں؟

آخری بات، کیا جس صلح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی گئی، اس صلح کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں ایک پہلو ناپسندیدہ بھی تھا، یہ اللہ کی منشا پر اعتراض کرنا ہے نہیں؟

نوٹ: یہیں اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے

بارے میں لکھا ہے کہ:

"...اس کے پیچھے قوت اور طاقت کارفرما تھی اور کوشش کے ذریعے یہ حکومت حاصل کی گئی تھی"۔ ①

اور اس سے پہلے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے مختصر دور خلافت کے بارے میں ایک جگہ یہ لکھ آئے ہیں:

"مگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، دنیوی بادشاہ نہیں، ان خلفائے راشدین کا تتمہ اور عکس تھے جن کا اقتدار ذات، غرض، نفس، خواہش اور مفاد جیسے مفاہیم سے ناآشنا تھا، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جس بے مثال ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا وہ ایک خلیفہ راشد ہی کے بس کی بات تھی.."۔ ②

اس اقتباس میں وہ دبے لفظوں میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے دور کو "خلافت راشدہ" کا دور بتا رہے ہیں، اور "تتمہ" اور "عکس" کے الفاظ صرف اس لیے لکھ رہے ہیں تاکہ کوئی ان سے یہ سوال نہ کر بیٹھے کہ کیا خلفاء راشدین پانچ ہیں؟؟

الغرض!

ہمارا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ:

اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ:

"خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلح کے ماحول کے متعلق وضاحت فرما دی تھی کہ یہ..هدنة على دَخَن..(ناگواری کے ساتھ صلح) ہوگی، نیز حدیث میں اسے .. جماعة على أقذاء..(کدورت کے ساتھ اجتماعیت) سے بھی تعبیر کیا گیا"۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۵۱.

② حوالہ مذکورہ ص ۳۴۹.

ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ حدیث پیش کی جائے جس میں یہ" وضاحت" نبی کریم ﷺ نے خود فرمائی کہ" سیدنا حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی صلح" ناگواری کے ساتھ صلح ہوگی اور یہی کدورت کے ساتھ اجتماعیت ہوگی؟؟ کیونکہ اسماعیل ریحان صاحب کی اس کتاب کو" مستند ترین تاریخ" کہا جا رہا ہے، اس لیے ان پر لازم ہے کہ وہ اصول حدیث کی رو سے اپنی یہ بات ثابت کریں کہ نبی کریم ﷺ نے خود کہیں اس صلح کے بارے میں ایسا فرمایا ہے۔

ہمیں اس پر بحث نہیں کرنی کہ اس صلح پر کچھ لوگوں کو ناگواری تھی یا نہیں تھی، یا اس میں کدورت تھی یا نہیں، ہمارا اعتراض اس بات کو صریح طور پر نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنے پر ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ اس صلح کی وجہ سے" خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے سلب ہوگئی تھی" یعنی چھین لی گئی تھی، کیا اسماعیل ریحان صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ تو اس صلح اور اس کے نتیجے میں اپنی خلافت سے دست برداری پر خوش نہ تھے، ان سے زبردستی یہ خلافت" چھین" لی گئی تھی؟؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خلافت کے سب سے بہترین حق دار سیدنا حسن رضی اللہ عنہ ہی تھے؟ کیا ان سے" سینیئر" صحابی موجود نہ تھے؟۔

ہمیں انہی تین بنیادی نکات کا جواب مطلوب ہے، لیکن کچھ حضرات اپنی ساری توجہ یہ ثابت کرنے پر مرکوز کیے ہوئے ہیں کہ ناگواری ہونا یا کدورت کا پایا جانا ایک طبعی امر ہے اس میں کونسی اعتراض والی بات ہے؟ لہٰذا یاد رہے کہ ہمارے بنیادی اعتراض وہ تین ہیں جو ہم نے اوپر بیان کر دیے ہیں۔

چند" کٹ حجتیاں" اور ان کا مختصر جائزہ

اب ہم مختصر طور پر ان چند" کٹ حجتیوں" پر بھی ایک نظر بھی ڈال دیتے ہیں، جو اب تک اسماعیل ریحان صاحب کے چند خود ساختہ" وکلاء" کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں (ہم نے خود ساختہ وکلاء اس لیے لکھا کہ ابھی تک ہمارے سامنے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں آیا کہ ان حضرات کو جناب اسماعیل ریحان صاحب نے اپنا وکیل صفائی یا اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے یا نہیں؟)۔

کٹ حجتی نمبر ا:

" اسماعیل ریحان صاحب نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ درحقیقت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب" منہاج السنۃ" کے حوالے سے کیا ہے، اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ کتاب بطور خاص خوارج وروافض اور نواصب کے رد پر مستند ترین دستاویز سمجھی جاتی ہے، اسماعیل ریحان صاحب نے جہاں یہ بات لکھی ہے اسی صفحے کے حاشیے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عبارت اور استدلال بننے والی روایت درج ہے، لہٰذا حقیقت میں یہ اعتراض اسماعیل ریحان صاحب پر نہیں بلکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسی بات ذکر کی ہے"۔ (ملخصاً)

جواب:

اسماعیل ریحان صاحب کا تحقیقی معیار اگر یہی تھا کہ انہوں نے صرف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ذاتی رائے کی بنیاد پر ایک ایسی بات بلا تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں کوئی اشارہ تک نہیں، تو پھر ان لوگوں کو جو" تاریخ امت مسلمہ" کو" مستند ترین" کتاب کہہ رہے ہیں اپنی بات پر دوبارہ غور کرنا چاہیے، یا یہ بتائیں کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی اس بات کی کیا دلیل پیش کی ہے؟ کیا انہوں نے ایسی کوئی حدیث پیش کی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ" ناگواری کے ساتھ صلح" یا" کدورت کے ساتھ اجتماعیت" والی بات میں" صلح حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہما" کے بارے میں بتا رہا ہوں؟؟ یا اس روایت کو بیان کرنے والے صحابی نے یہ بات فرمائی ہو؟ اگر ایسی کوئی صحیح حدیث ہے تو بات ہی ختم وہ پیش کر دی جائے، اور اگر ایسی کوئی حدیث نہیں، اور نہ ہی سنن ابوداود کی روایت میں اس صلح کی طرف کسی قسم کا کوئی اشارہ بھی ہے تو پھر یہ صرف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اپنا استنباط اور رائے ہی سمجھا جائے گا، اور کسی کا یہ دعوی نہیں کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے تسامح یا فروگذاشت ہونا ممکن نہیں، اصول تو یہ ہے کہ کسی حدیث کی جو تشریح، شارحین کرتے ہیں، شارحین کی اس تشریح کو بھی ہم " حدیث رسول" نہیں کہہ سکتے، بلکہ اسے شارحین کی تشریح ہی کہا جائے گا، لہٰذا یہاں صرف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک بات کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ یہ لکھ دینا کہ یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صلح کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے یہ بے شک ایک غیر محتاط طرز عمل ہے، اور ایک ایسے مصنف کو جو" مستند ترین تاریخ" لکھنا چاہتا ہے بلا تحقیق ایسی بات نقل کر دینا قابل مواخذہ ہی ہے، تحقیقی میزان میں یہ

بات قابل اعتراض ہی ہے۔

باقی رہا " خود ساختہ وکلاء صفائی" کا یہ کہنا کہ چونکہ آج تک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس بات پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ لہٰذا اب اسماعیل ریحان صاحب پر بھی کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں تو ایسی دلیلیں وہی دیا کرتے ہیں جن کی علمی سطح بہت نیچے ہوتی ہے، نیز امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو لکھا اس کا رد اسماعیل ریحان صاحب سے پہلے مولانا محمد نافع صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب (سیرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جلد ا صفحہ ۲۳۱۔ ۲۳۲) پر کیا ہے (اگرچہ انہوں نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ یا کسی کا نام نہیں لیا) یاد رہے اس کتاب پر تقریظ سیدنا مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے تحریر فرمائی ہے جس کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت پر جو کتابیں اب تک میری نظر سے گذری ہیں یہ کتاب ان سب میں بہتر ہے"۔

نیز مولانا محمد ظفر اقبال صاحب نے اپنی کتاب" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ۔ گمراہ کن غلطیوں کا ازالہ" کے صفحہ ۲۴۳ پر عنوان قائم کیا ہے "صلح بر کدورت کا الزام" اور پھر اس کی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ" ایک مجمل حدیث کی بنیاد پر اس صلح کو بر کدورت ٹھہرانا ہرگز صحیح نہیں" ①۔

یاد رہے اس کتاب پر مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمہ اللہ نے تقریظ لکھی اور اس کتاب کو" لاجواب" لکھا، نیز مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید رحمہ اللہ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ کی بھی اس کتاب پر تقریظات موجود ہیں، ہم نہیں سمجھتے کہ جناب اسماعیل ریحان صاحب کی نظر سے یہ دونوں کتابیں نہیں گذری ہوں گی۔

---

① دیکھیں کتاب مذکور کا صفحہ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔

لہٰذا یہ کہنا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جو بات اپنی رائے کی بناء پر لکھی اس بات کا آج تک کسی نے رد نہیں کیا یہ بھی درست نہیں، اور اگر بالفرض آج تک کسی نے اس طرف توجہ نہ بھی دی ہوتی تو کیا آج کسی کو اس پر تحقیق کر کے اس غلطی کی نشاندھی کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا؟

کٹ حجتی نمبر ۲:

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بجائے یہ ثابت کرنے کے کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں یہ فرمایا کہ "صلح بر کدورت" اور "ناگواری کے ساتھ صلح" والی بات میں نے اسی "صلح حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہما" کے بارے میں فرمائی ہے، یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی جارہی ہے کہ اگر یہ صلح کئی لوگوں کو ناگوار گذری یا انہوں نے کدورت کے ساتھ اسے قبول کیا تو اس میں اعتراض والی کیا بات ہے؟

اسے "خودساختہ وکلاء صفائی" نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> "صلح حدیبیہ کہ جس کے فتح مبین اور خیر عظیم ہونے پر نص قطعی موجود ہے لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ثابت ہے کہ اس صلح میں شریک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کو اس موقع پر انتہائی ناگواری تھی، سیدنا عمر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اظہار بھی کیا۔ یہ رنج طبعی تھا لیکن اس کے باوجود وہ حضرات اس صلح پر عملاً راضی تھے۔ (اس طبعی رنج اور خیر کے جمع ہونے کی اور بھی بہت سی مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں) اسی طرح یہاں بھی صلح کے متعلق اگر ایک طبقہ بطور خاص عراقی صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ طبعاً رنجیدہ تھا تو وہ بھی ایک فطری بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عملاً انہوں نے صلح کے تمام مراحل میں ساتھ دیا اور اس

کار خیر کو تکمیل تک پہنچایا اور بعد میں بھی اس پر کاربند رہے"۔

جواب:

غور فرمائیں! یہ خود ساختہ وکلائے صفائی کس حد تک چلے گئے کہ "مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں" کے درمیان ہونے والی اس عظیم الشان صلح کو جس کی بشارت نبی کریم ﷺ نے دی تھی، اس صلح پر قیاس کیا جا رہا ہے جو مسلمانوں کی کفار کے ساتھ ہوئی تھی، اور پھر "صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہ اللہ" کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ (بشارت نبوی کے مطابق ہونے والی اس صلح پر) طبعاً رنجیدہ تھے۔۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب اسماعیل ریحان صاحب اگر اپنے "خود ساختہ وکلائے صفائی" کا یہ بیانیہ پڑھ لیں تو وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ جائیں۔

ہم اصولی طور پر ان وکلائے صفائی سے یہ پوچھتے ہیں کہ آپ پہلے یہ ثابت کرو کہ:

آنحضرت ﷺ نے صلح حسن و معاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ اس صلح سے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہ اللہ خاص طور پر اور مسلمان عام طور پر "رنجیدہ" ہوں گے اور انہیں اس صلح پر ناگواری ہوگی، اس کے بعد آگے بات چلے گی۔

کٹ حجتی نمبر ۳:

"اسماعیل ریحان صاحب یا امام تیمیہ رحمہ اللہ کا صلح سے متعلق یہ موقف عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم سے متصادم نہیں"۔

جواب:

کیا اسماعیل ریحان صاحب کی اس "مستند ترین" کتاب کا تحقیقی معیار یہ مقرر کیا گیا ہے کہ "جو بات عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم سے متصادم نہ ہو، وہ چاہے غیر مستند

اور غیر ثابت ہو، اسے لے لیا جائے؟؟ اور کسی ایسی بات کو نبی کریم ﷺ کی طرف قطعی طور پر منسوب کر دینا جو عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم سے متصادم نہ ہو یہ جائز ہے؟؟ اس بات کی وضاحت کر دی جائے، کیونکہ یہ خود ساختہ وکلائے صفائی ہر بات کے جواب میں یہی کہتے پائے گئے ہے کہ" یہ بات عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم سے متصادم نہیں لہٰذا اگر اسماعیل ریحان صاحب نے یہ لکھ دی تو کیا ہوا؟"

جناب اسماعیل ریحان صاحب
اور خلافت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما

نوٹ! ہمارا مقصد یہاں اس بات سے بحث کرنا نہیں کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت قائم ہوئی تھی یا نہیں؟ اور اگر قائم ہوئی تھی تو کہاں کہاں قائم ہوئی تھی؟ اور ان کی خلافت کی کیا حیثیت تھی؟، بلکہ ہم یہاں صرف جناب اسماعیل ریحان صاحب کی" مستند ترین" سمجھی جانے والی تحقیق کا معیار بتانا چاہتے ہیں، لہٰذا اس قسط کو اسی تناظر میں پڑھا جائے۔

جناب اسماعیل ریحان صاحب، سیدنا عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) کی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " مصر سے خراسان تک پوری امت نے بلا توقف اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھایا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ مان لیا، اس خلافت کے لیے کوئی فوج کشی ہوئی نہ کسی کو خریدا گیا، ہر جگہ رضا و رغبت سے بیعت ہوئی، اس وقت بنو امیہ اور امرائے شام میں سے بعض سیاست دانوں نے سخت تعصب کا ثبوت دیتے ہوئے اس خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا....." ①

لیکن پہلے یہ لکھ آئے ہیں کہ:

" بنی ہاشم کے بعض بزرگوں مثلاً: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۳۴.

حنفیہ رحمہ اللہ نے آپ (یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ناقل) کی بیعت نہیں کی تھی اور اس تمام مدت میں غیر جانبدار رہے تھے، اس سے بھی آپ کی (یعنی عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما - ناقل) کی مقبولیت کو نقصان پہنچا اور حامیوں میں کمی ہوئی"۔ ①

اور پھر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے بارے میں یہ بھی یہیں لکھا ہے کہ:

"مرکز خلافت کا صوبوں سے مربوط تعلق نہ تھا، بلکہ صوبہ دار اپنے معاملات خود طے کرتے تھے، خاص مواقع کے سوا مرکز سے ہدایات کم جاری ہوتی تھیں، خود مختاری کے اس ماحول میں امراء کے لئے آسان تر تھا کہ جب حریف کا دباؤ بڑھے یا پرکشش مراعات ملیں تو اس کی صف میں چلے جائیں"۔ ②

اب سوال یہ ہے کہ:

اگر یہ بات درست ہے کہ مصر سے خراسان تک پوری امت نے بلا توقف سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ مان لیا تھا اور برضا و رغبت مان لیا تھا تو پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ اور ان جیسے دیگر خاص طور پر بنو ہاشم کے بعض بزرگوں نے ان کی بیعت کیوں نہ کی؟ وہ کیوں غیر جانبدار رہے؟ کون سے دو فریقوں کے درمیان جھگڑا تھا جس میں یہ دونوں اور دوسرے بزرگ غیر جانبدار رہے تھے؟، یہ حضرات تو "بنو امیہ" میں سے نہ تھے، کیا انہوں نے بھی (نعوذ باللہ) "سخت تعصب کا ثبوت دیتے ہوئے" یہ خلافت قبول نہیں کی تھی؟؟ یا اس کی

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ صفحہ ۶۲۱، زیر عنوان ''خلافت زبیریہ کے سقوط کے اسباب''.

وجہ کوئی اور تھی؟، نیز جب بقول اسماعیل ریحان صاحب، مصر سے خراسان تک تمام امت نے بلاتوقف سیدنا ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) کو خلیفہ مان لیا تھا اب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بنو ہاشم کے دیگر بزرگوں نیز دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ان کی بیعت نہ کرنا کس معنی میں لیا جائے گا اور وہ غیر جانبدار کیوں رہے تھے؟؟

نیز مرکز اور صوبوں کے تعلق کا جو نقشہ اسماعیل ریحان صاحب ہمیں بتا رہے ہیں اس سے تو یہ سمجھ آتی ہے یہ کہ طوائف الملوکی کا دور تھا، صوبے دار جب چاہتے اپنی مرضی سے حریف سے ڈر کر یا لالچ میں آ کر اس کے ساتھ مل جاتے۔

پھر آگے ایک جگہ زیر عنوان" دمشق کا نیا حکمران: عبدالملک" لکھتے ہیں:

" دمشق کے تخت پر اب عبدالملک بن مروان براجمان تھا، اس اکتیس سالہ نوجوان کی موجودہ اور سابقہ زندگی میں غیر معمولی فرق تھا، باپ کی مسند سنبھالنے سے پہلے، وہ دن رات قرآن وحدیث اور فقہ جیسے علوم پڑھنے میں منہمک رہتا، نوافل اور تلاوت کی کثرت اس کے معمولات کا حصہ تھی، کبیرہ گناہوں ہی سے نہیں شک وشبہے کے معاملات سے بھی کوسوں دور رہتا تھا، معرکہ مَرجِ راہط میں جب بنوامیہ کے تقریباً سب امراء اور جرنیل اپنا اقتدار بچانے کے لیے جمع ہوئے تھے تب بھی یہ جنگ میں شریک نہیں تھا، کیوں کہ اس کے نزدیک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف کوئی بھی اقدام مشکوک تھا اور احتیاط اسی میں تھی کہ ایسی جنگ میں شرکت نہ کی جائے، مگر اب جبکہ شام اور مصر کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی، وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو شرعی خلیفہ ماننے پر تیار نہ تھا، اور ہر قیمت پر ان کی حکومت ختم کرنا چاہتا تھا، اس سے اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی مصلحتیں انسان کی سوچ، کردار اور خیالات کو کس طرح بدل دیا کرتی ہیں"۔ ①

سوال یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ انہونیاں صرف بنوامیہ میں ہی ہوئیں کہ عبدالملک بن مروان جیسا متقی و پرہیزگار اور قرآن وحدیث کا ماہر اور فقیہ، ایک ہی رات میں خلافت ملتے ہی سب کچھ بھول بیٹھا اور اس کی سوچ بدل گئی؟، اور پھر اسی بنوامیہ کا ایک خلیفہ ایسا بھی ہوا جو پہلے عیش وعشرت کی زندگی گزارا کرتا تھا لیکن خلافت ملتے ہی ایک ہی رات میں وہ "عمر ثانی" بن گیا اور "خلافت راشدہ" کو چار میں منحصر کرنے والے بھی انہیں "پانچواں خلیفہ راشد" کہنے لگے؟... یا ایسے عجائبات کسی اور قوم میں بھی پائے جاتے ہیں؟ بلکہ اور اوپر جائیں تو یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمیں یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ اپنے والد کی زندگی میں اس کے فسق و فجور کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا، لیکن خلافت ملتے ہی ایک ہی رات میں اس کا فسق وفجور پورے ملک میں ایسا مشہور ہوگیا کہ اس فسق کی وجہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو اس کے خلاف نکلنا پڑا؟؟

اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ بقول مؤرخ اسلام جناب اسماعیل ریحان صاحب، اس وقت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شرعی خلیفہ تھے، لہٰذا عبدالملک بن مروان اور اس کا والد مروان، دونوں باغی تھے.. تو ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ رجب سنہ ۶۰ ہجری (سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات) سے لے کر ۹ رجب سنہ ۶۴ ہجری تک اسلامی حکومت کا "شرعی خلیفہ" بھی کوئی تھا یا تقریباً چار سال کا یہ زمانہ بغیر خلیفہ کے ہی رہا اور امت میں انتشار ہی رہا اور خلافت وحکومت کہیں موجود نہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۷۸.

تھی؟ اگر خلافت تھی اور کہیں بھی بغاوت موجود نہیں تھی تو اس خلافت کے مخالفین اور اسے ختم کرنے کی کوشش کرنے والوں کو بھی باغی اور اتحاد امت کو پارہ پارہ کرنے والی سیاست کرنے والے (جیسا کہ مؤرخ اسلام نے صفحہ ۵۵۵ پر ایک سرخی لگائی ہے) کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟، یا مؤرخ اسلام کی "غیر جانبداری" وہاں دم توڑ دیتی ہے؟

پھر جناب اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق ۹ رجب سنہ ۶۴ ہجری سے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شرعی خلیفہ بن گئے۔

پھر ایک جگہ لکھا کہ:

''سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت قائم ہو چکنے کے بعد حجاج بن یوسف اور اس کے آقا مروان اور عبدالملک یقینا باغی تھے''۔ ①

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت نو رجب ۶۴ ہجری سے شروع ہوئی تو رجب ۶۰ ہجری میں سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کی وفات سے لے کر ۹ رجب ۶۴ ہجری تک کون کون شرعی خلیفہ تھا؟ یا امت بغیر خلیفہ اور امیر کے ہی رہی؟؟

کیا اس دوران امت نے کسی کو خلیفہ بنایا یا نہیں؟ خاص طور پر بقول اسماعیل ریحان صاحب یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۴ ہجری میں ہوئی، اور پھر اس کے ۴۰ دن بعد اس کے بیٹے معاویہ بن یزید کی وفات بھی ہوگئی (یعنی ربیع الثانی میں) اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کو اسماعیل ریحان صاحب نے رجب ۶۴ ہجری سے شروع کیا ہے تو معاویہ بن یزید کی ربیع الثانی

① تاریخ امت مسلمہ: ج ۲ ص ۶۷۲.

میں وفات کے بعد رجب تک امت کا کون خلیفہ تھا؟؟ بہر حال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے لے کر ۹ رجب ۶۴ تک کوئی خلیفہ اگر موجود تھا تو اس کی خلافت قائم ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف خروج کرنے والوں اور اس کی بیعت نہ کرنے والوں، اس کے خلاف تحریک چلانے والوں یا بیعت توڑنے والوں کا کیا حکم ہوگا؟؟

ان سوالوں کا معقول جواب کیوں اس" مستند ترین" تاریخ میں نہیں دیا گیا؟

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر کرتے ہوئے اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

" سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپ نے ان سے بیعت کر لی تھی مگر عملاً غیر جانب دار رہے.." ①

آگے لکھا:

" سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی کش مکش میں کوئی حصہ نہیں لیا..." ②

پھر اسی صفحہ کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

" عام خیال یہی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سرے سے بیعت نہیں کی تھی کیوں کہ عملاً وہ غیر جانبدار تھے، بیعت کرنے والوں میں صراحتاً ان کا نام نہیں ملتا، جبکہ واقدی کی ایک روایت میں بیعت نہ کرنے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا نام بھی لیا گیا ہے... تاہم غالب ظن یہ ہے کہ جن روایات میں مہاجرین و انصار کی عمومی بیعت کا بلا استثناء ذکر ہے، ان میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۶۴.

② حوالہ مذکورہ ص ۶۶۷.

تھے..."

(آگے اسماعیل ریحان صاحب نے طبقات ابن سعد کے حوالے سے یہ طویل عبارت نقل کی ہے:

بايعه طَلْحَة. والزبير. وسعد بْن أَبِي وقاص وسعيد بْن زَيْد بْن عَمْرو بْن نفيل. وعمار بْن ياسر. وأسامة بن زَيْد. وسهل بْن حُنَيْف. وأبو أيوب الْأَنْصَارِيّ. ومحمد بْن مسلمة. وزيد بن ثابت. وخزيمة بن ثابت وجميع من كان بالمدينة مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ - ﷺ - وغيرهم"

(ترجمہ از ناقل: حضرات طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، عمار بن یاسر، اسامہ بن زید، سہل بن حنیف، ابوایوب انصاری، محمد بن مسلمۃ، زید بن ثابت، خزیمہ بن ثابت اور تمام وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو مدینہ میں اس وقت موجود تھے ان سب نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین) ①

آگے لکھتے ہیں:

"رہی واقدی کی روایت تو اس کی قوت کچھ زیادہ نہیں، اس لیے ظن غالب ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نفس بیعت کر لی تھی مگر عملی طور پر نصرت سے کنارہ کش رہے جیسا کہ اور بھی بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ نے احتیاطاً یہی طرز عمل اختیار کیا تھا..." ②

ہماری زیر بحث یہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت یا آپ کی بیعت نہیں، بلکہ

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۶۷ حاشیہ۔

اسماعیل ریحان صاحب کی بیان کردہ تاریخ ہے، لہٰذا ہمارا سوال یہ ہے کہ:

صفحہ ۶۶۴ پر انہوں نے بغیر کسی "ظن" کے یہ لکھا تھا کہ:

" سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی"۔

اور پھر یہ لکھا کہ:

" عام خیال یہی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سرے سے بیعت نہیں کی تھی"۔

ظاہر ہے یہ عام خیال مؤرخین کا ہی ہوگا، اور پھر اسماعیل ریحان صاحب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

" بیعت کرنے والوں میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نام مذکور نہیں"

اور پھر یہ بتاتے ہیں کہ:

" واقدی کی ایک روایت میں بیعت نہ کرنے والوں میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نام بھی ہے"۔

اور پھر اپنا "ظن غالب" بتاتے ہیں، اور اس کے حق میں طبقات ابن سعد کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ فلاں فلاں صحابی نے یہ بیعت کی تھی... لیکن عجیب بات یہ ہے کہ واقدی کی اس روایت کے بارے میں جس میں کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام لے کر بیعت نہ کرنے کا ذکر ہے، لکھتے ہیں کہ: " واقدی کی روایت کی قوت کچھ زیادہ نہیں"، لیکن طبقات ابن سعد سے جو عبارت پیش کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ نہیں لکھتے کہ اس کی سرے سے وہاں کوئی سند مذکور ہی نہیں، نہ واقدی سے نہ کسی اور سے، بلکہ بات یوں شروع ہوتی ہے:

"ذكر قَتلِ عُثمَان بن عفان وبيعة علي بن أبي طَالِب رضی اللہ عنہما: قَالَ:

قَالُوا لمّا قُتِلَ عُثْمَان. رضی اللہ عنہ. يوم الجمعة لثماني عشرة ليلة مضت من ذي الحجّة سنة خمس وثلاثين وبويع لعلي بْن أبي طَالِب. رضی اللہ عنہ. بالمدينة. الغد من يوم قُتِلَ عُثْمَان. بالخلافة بايعه طَلْحَة. والزبير. وسعد بْن أَبِي وقاص.... الخ"

یعنی ابن سعد رحمہ اللہ نے یہ بات یوں شروع کی ہے: قالوا سے، یعنی انہوں نے کہا.. کس نے کہا؟ یہ بیان ہی نہیں، تو پھر امانت داری تو یہ تھی ناں کہ اسماعیل ریحان صاحب طبقات ابن سعد کی اس عبارت کے بارے میں بھی لکھتے کہ: "یہ بات بھی بلا سند ہے، اس کی بھی کوئی سند مذکور نہیں" ؟؟

اور سب سے خطرناک بات یہ کہ، اسماعیل ریحان صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کر کے، آپ کو خلیفہ راشد و شرعی خلیفہ تسلیم کرنے کے باوجود بعد میں آپ کی نصرت سے کنارہ کشی اختیار کی....①

نوٹ: حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے زمانہ فتنہ میں نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور نہ ہی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی، یہاں تک کہ جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق ہو گیا تو اس کے بعد انہوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔

(كان امتنع أن يبايع لعلي أو معاوية، ثم بايع معاوية لما

---

① صفحہ ٦٦٧ حاشیہ پڑھیں۔

اصطلح مع الحسن بن علي و اجتمع عليه الناس) ①

نیز شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يُبَايِعْهُ، وَلَمْ يُقَاتِلْ مَعَهُ كَسَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، وَابْنِ عُمَرَ وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ، وَزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، وَأَمْثَالِ هَؤُلَاءِ مِنَ السَّابِقِينَ۔

ترجمہ: صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایسے بھی تھے جنہوں نے ان کی (سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی۔ ناقل) نہ ہی بیعت کی اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیا، جیسے سعد بن ابی وقاص، اسامہ بن زید، ابن عمر، محمد بن مسلمہ، زید بن ثابت، ابو ہریرہ اور ان جیسے بہت سے سابقون اولون میں سے۔ ②

اسماعیل ریحان صاحب تو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک ذاتی رائے کی بنیاد پر صلح حسن ومعاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں "کدورت اور ناگواری کے ساتھ صلح" کی بات کو بلا دھڑک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہوئے نہیں ہچکچائے، اور ان کے خود ساختہ وکلائے صفائی یہ کہتے نہیں تھکتے کہ "اسماعیل ریحان صاحب نے تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بات کو بنیاد بنا کر یہ لکھا ہے، کسی کی ہمت ہے تو وہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر فتویٰ لگا کے دکھائے"، تو اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس کتاب "منہاج السنۃ" میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صرف وہی ایک بات لکھی تھی جس کی بنیاد پر اسماعیل ریحان صاحب نے بلا تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے الفاظ منسوب کر دیے جن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے صادر ہونا ہرگز ثابت نہیں،

① فتح الباری، ج ۱۳ ص ۱۹۵ المکتبة السلفية .
② منهاج السنة، ج ۷ ص ۴۷۳، طبع السعوديه .

اور اسی کتاب میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی دوسری تحقیقات ان کی نظر سے نہیں گذریں؟؟ خاص طور پر ان کی یہ تحقیق کہ سیدنا ابن عمر (رضی اللہ عنہما) سمیت بہت سے "سابقون اولون" سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے الگ رہے تھے؟؟

نیز کیا اسماعیل ریحان صاحب کی نظر سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ بات نہیں گذری تھی کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے زمانہ فتنہ میں نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور نہ ہی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی؟؟

کیا غیر جانبدار تحقیق اسی کا نام ہے؟

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور آپ کی نماز جنازہ

جناب اسماعیل ریحان صاحب، خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم ہنگامے کی آواز سن کر گھر میں واپس گھس گئے اور باغیوں سے لڑتے لڑتے شدید زخمی ہو گئے بعد میں مدینہ کے لوگوں نے ان تینوں کو لہولہان حالت میں اٹھایا''۔ ①

پھر اسی صفحہ پر لکھا:

" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مدینہ منورہ میں پھیل گئی، اسی رات حضرت علیؓ، حضرت طلحہ، حضرت حسن، حضرت زید بن ثابت، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم جوق در جوق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے آئے، جنازے میں شرکت کے لیے مدینہ منورہ کی خواتین اور بچے تک شہر کی جنازہ گاہ میں جمع ہو گئے"۔ ②

پھر آگے لکھا کہ:

''جنازے میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۴۶.

تھا، جنازہ قصر عثمان میں رکھا گیا اور لوگ گروہ در گروہ اندر جا کر زیارت کرتے رہے، ایک بد بخت باغی نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طمانچہ ضرور مارے گا، جنازے کی چارپائی کے پاس آ کر اس نے چہرہ مبارت پر دست درازی کرنا چاہی، اسی وقت ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ شہید کو غسل نہیں دیا گیا، کپڑے ہی کفن قرار پائے، جنازے کی چارپائی لائی گئی، مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد جنازے کو بقیع کے قبرستان میں لے جایا گیا...''①

پھر لکھا:

"یہ بات طے ہے کہ شہادت کے وقت مدینہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ بڑی تعداد میں موجود تھے، وہ آپ کے دفاع پر قدرت رکھتے تھے، ان کا ہاتھ روکے رکھنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قسم دینے کی وجہ سے تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قسم دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے باعث تھا، باغی مدینہ پر اس طرح قابض نہیں تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی بالکل بے بس ہوتے، اس لیے ضعیف روایات میں منقول یہ باتیں مشکوک ہیں کہ جنازہ بے گور و کفن پڑا رہا، چند افراد نے نماز جنازہ پڑھی اور چھپ چھپا کر کسی گمنام گوشے میں تدفین کر دی، البتہ یہ ظاہر ہے کہ فتنے، ہنگامے اور خوف کی فضا کے باعث نماز جنازہ میں اتنے لوگ شریک نہیں ہوئے ہوں گے جتنے امن وامان کی حالت میں شریک ہوتے..."②

①② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۴۶، ۱۴۷.

یہاں ہمارے چند سوال ہیں:

اسماعیل ریحان صاحب نے یہ تأثر دیا ہے کہ جیسے اس سانحہ کے وقت مدینہ منورہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور وہ باغیوں کے مقابلے میں زیادہ تھے یا باغیوں کا قلع قمع کر سکتے تھے لیکن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے چونکہ انہیں روک دیا تھا اس لیے وہ چپ چاپ یہ سب دیکھتے رہے، لیکن دوسری طرف وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر، سیدنا حسن اور مروان بن الحکم باغیوں سے لڑتے لڑتے شدید زخمی ہو گئے اور بعد میں لوگوں نے ان تینوں کو لہولہان حالت میں اٹھایا۔

تو کیا سیدنا عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) اور سیدنا حسن (رضی اللہ عنہ) وغیرہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی قسم کو توڑ دیا تھا؟؟

اور اسماعیل ریحان صاحب پہلے ہمیں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ:

"حج کے ایام آ گئے تھے، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ حجاج کے قافلے کی قیادت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائیں، انہوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! اللہ کی قسم، ان شر پسندوں سے جہاد کرنا میرے نزدیک حج سے بڑھ کر ہے، مگر خلیفہ ثالث نے قسم دے کر انہیں حکم کی تعمیل کا کہا تاکہ حج کا عظیم الشان اسلامی رکن حسب معمول پورے اہتمام سے ادا ہو"۔ ①

تو اس حجاج کے قافلے میں یقیناً مدینہ منورہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ ہی گئے ہوں گے، لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ اس سانحۂ کے وقت مدینہ منورہ میں صحابہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۳۸.

کرام رضی اللہ عنہم کی بہت قلیل تعداد موجود تھی، اور اسی لیے باغیوں نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ وقت چنا تھا. اسماعیل ریحان صاحب صرف یہ تأثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس وقت مدینہ منورہ پر باغیوں کا مکمل تسلط نہیں تھا اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے ان کی تعداد باغیوں کے مقابلے میں کم نہیں تھی، اس کے پیچھے اسماعیل ریحان صاحب کا ایک خاص مقصد ہے جس پر ہم آگے بات کریں گے۔

پھر وہ خود یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ:

"حج کے لئے قافلہ تیار ہوا تو ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی قافلے کے ساتھ حج پر روانگی کا ارادہ کرلیا تھا، کیونکہ باغیوں کے تسلط کے بعد آپ کو شدید خطرہ لاحق ہو چکا تھا کہ کہیں یہ شر پسند عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد امہات المؤمنین کو بھی نشانہ نہ بنائیں.." ①

غور فرمائیں! اسماعیل ریحان صاحب خود" باغیوں کے تسلط کے بعد" کے الفاظ لکھ رہے ہیں، جو اس بات کا اقرار ہے کہ واقعی اس وقت مدینہ منورہ پر باغیوں کا مکمل تسلط تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق سیدنا عبداللہ بن زبیر، سیدنا حسن اور مروان بن الحکم رضی اللہ عنہم باغیوں سے لڑتے لڑتے شدید زخمی ہو گئے اور بعد میں لوگوں نے ان تینوں کو لہولہان حالت میں اٹھایا، اور پھر اسماعیل ریحان صاحب بتاتے ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ مروان بن الحکم نے پڑھائی تھی، جی وہی مروان بن الحکم جنہیں لوگوں نے لہولہان حالت میں اٹھا کر

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۳۸.

باہر نکالا، کیا وہ اس قابل تھے کہ نماز جنازہ پڑھا سکیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا مدینہ منورہ میں مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت اس وقت موجود نہ تھی؟ کیا اسماعیل ریحان صاحب نے یہی تاثر دینے کی کوشش نہیں کی کہ اس وقت مدینہ منورہ میں ایک بڑی تعداد صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کی موجود تھی؟ اور کیا وہ یہ نہیں بتا رہے کہ سیدنا علی، طلحہ، حسن، زید بن ثابت، کعب بن مالک اور عام صحابہ (رضی اللہ عنہم) جوق در جوق سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے آئے؟؟ اور جنازے میں شرکت کے لئے مدینہ منورہ کی خواتین اور بچے تک شہر کی جنازہ گاہ میں جمع ہو گئے؟؟ پھر کیا ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اس وقت مدینہ میں بھی تھے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے نماز جنازہ کیوں نہ پڑھائی؟ کہ ایک "لہولہان" اور "شدید زخمی" کو نماز جنازہ پڑھانی پڑی؟ اور اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی اکثریت اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھی تو کہاں تھی؟؟ یاد رہے! اسماعیل ریحان صاحب کا کہنا ہے کہ "باغی مدینہ منورہ پر اس طرح قابض نہ تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی بالکل بے بس ہوتے"، لیکن دو سطروں پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ: "ظاہر ہے کہ فتنے، ہنگامے اور خوف کی فضا کے باعث نماز جنازہ میں اتنے لوگ شریک نہیں ہوئے ہوں گے"۔ ①

اور چوتھا سوال یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب، بار بار ان فسادیوں اور قاتلوں کو "باغی" لکھ رہے ہیں، اور پھر یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ "وہ مدینہ پر اس طرح

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۳۸.

قابض نہ تھے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے بس ہوتے"، لیکن دوسری طرف اسماعیل ریحان صاحب اس بات پر بھی بہت زور دیتے ہیں کہ:

"بغاوت کا اطلاق ہونے کے لیے علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے"۔ ①

تو اگر ان لوگوں کا مدینہ پر مکمل کنٹرول اور قبضہ نہیں تھا تو انہیں "باغی" کیسے کہا جا سکتا ہے؟؟

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۶۹.

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر باغیوں کا دباؤ تھا؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

''سابقہ باغیوں (یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والے جو بغاوت آپ کی شہادت پر منتج ہوئی، انہیں سابقہ باغی کہا جا رہا ہے۔ ناقل) میں سے اشتر نخعی کا کوفہ میں، حکیم بن جبلہ کا بصرہ میں اور محمد بن ابو حذیفہ کا مصر میں بہت اثر ورسوخ تھا، ان میں سے بعض سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر کے اپنے علاقوں کو لوٹ چکے تھے، ان پر قابو پانا، میدان سیاست میں بے دخل کرنا اتنا آسان نہ تھا اس کوشش میں خود مسند خلافت بھی الٹ سکتی تھی اور پورا عالم اسلام ایک نئے بحران کی زد میں آ سکتا تھا''۔ ①

نیز لکھتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی جیسے چند افراد (جو کہ اسماعیل ریحان صاحب کے اقرار کے مطابق باغی گروہ میں شریک تھے، بلکہ "اشتر نخعی" کو اسماعیل ریحان صاحب نے "صف اول کا باغی" لکھا ہے۔ ناقل) کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق عہدے بھی دیئے''۔ ②

---

①② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۶۷، ۱۷۲.

تبصرہ:

کیا یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ سیاسی مصلحت کی خاطر اور حکومت کو خطرات سے بچانے کے لئے ایسے مجرموں سے صرف نظر بھی کیا جاسکتا ہے جن کا اثر ورسوخ زیادہ ہو؟؟ اور جو ایک خلیفہ راشد کے خلافت ایسی بغاوت میں سرگرم رہے ہوں جس کا نتیجہ ایک خلیفہ راشد کی شہادت کی صورت میں نکلا ہو؟. کیا یہی دلیل ہر جگہ پیش کی جاسکتی ہے؟؟

پھر جناب اسماعیل ریحان صاحب اپنی کتاب میں بار بار یہ بات لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں نے (جس کے نتیجے میں ایک خلیفہ راشد کو شہید کردیا گیا۔ ناقل) چونکہ بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی تھی، اس لئے اب انہیں اسلامی شہری ہونے کی حیثیت سے تمام حقوق حاصل تھے، اگر وہ غیر مسلم بھی ہوتے، تب بھی ان کی جان ومال کی حفاظت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرض منصبی تھا''۔ ①

سوال یہ ہے کہ کیا متفقہ خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تحریک بپا کرنے والے جس کے نتیجے میں ان کی المناک شہادت ہوگئی، ان لوگوں کا جرم صرف اس وجہ سے قابل معافی ہوگیا کہ انہوں نے بعد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی تھی؟؟

کیا اسماعیل ریحان صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی بھی خلیفہ کے خلاف بغاوت کرکے، اسے قتل کرکے، پھر اس کے بعد نئے خلیفہ کی بیعت کرنے سے

---

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۸۸ وغیرہ۔

باغیوں اور قاتلوں کا جرم معاف ہو جاتا ہے؟؟ اور یہی سمجھا جائے گا کہ انہوں نے توبہ کر لی ہے؟؟

پھر ان کے جان و مال کی حفاظت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا فرض منصبی بتانا، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کا دروازہ نہیں کھولے گا؟؟ کیا یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اس اعتراض کی تائید نہیں کہ" وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو تحفظ فراہم کر رہے تھے"؟؟. یعنی ایک خلیفہ راشد کے قتل کی تحریک میں شامل رہنے والوں کی جان و مال کی حفاظت سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنا فرض سمجھتے تھے؟؟ یا للعجب.

اگر تیسرے خلیفہ راشد کے خلاف بغاوت کی تحریک چلا کر اور انہیں شہید کرنے والے صرف اس وجہ سے پاک اور صاف ہو گئے کہ انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی، پھر تیسرے خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو مدینہ لانا، اور مروان بن الحکم پر اعتماد کرنا بھی کسی بات کی دلیل بن سکتا ہے یا نہیں؟؟

جناب اسماعیل ریحان کی تاریخ دانی کی چند جھلکیاں

موصوف" تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۳۷" کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

" مولانا شیر محمد علوی نے سیدنا مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے نایاب رسالے" شہادت حسین وکردار یزید" کے شروع میں.....الخ"

پھر یہیں دوبارہ لکھتے ہیں:

"مکمل حوالوں اور عبارات کے لیے دیکھئے: شہادت حسین وکردار یزید، ص ۵ تا ۱۵"۔

ہمارا دعوی ہے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کسی کتاب یا کسی رسالے کا نام " شہادت حسین وکردار یزید" نہیں، شیر محمد علوی صاحب نے مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے مکتوبات کے مجموعے بنام" قاسم العلوم" میں سے ایک فارسی مکتوب کا اردو ترجمہ الگ رسالے کی صورت میں شائع کیا تھا (یہ اردو ترجمہ پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی رحمہ اللہ کا کیا ہوا ہے) اور شیر محمد علوی صاحب نے اپنی طرف سے اس رسالے کا نام" شہادت امام حسین وکردار یزید" رکھ دیا تھا...

لیکن اسماعیل ریحان صاحب اسی نام کے رسالے کو مولانا قاسم نانوتوی کا " نایاب رسالہ" لکھ رہے ہیں... جبکہ مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے اس فارسی مکتوب کا نام ہرگز یہ نہیں لکھا تھا... بلکہ اس مکتوب کا نام ہے" در تحقیق و اثبات

شہادت امام حسین مطابق قواعد سنیاں"۔ ①

حیی بن اخطب کا قتل اور اسماعیل ریحان صاحب کا ایک عجوبہ:

جناب اسماعیل ریحان، اُم المؤمنین صفیہ بنت حُیی رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا تعلق ایک اسرائیلی خاندان سے تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے جا ملتا تھا، ان کا باپ حُیی بن اخطب بنو نضیر کے یہودیوں کا سردار تھا جو غزوۂ بنو نضیر میں قتل ہوا"۔ ②

اور اسماعیل ریحان صاحب ہی ہمیں غزوہ بنو نضیر کی تفصیل یوں بتاتے ہیں کہ:

" بنو نضیر کا رئیس سلاّم بن مِشکم، قریش مکہ سے ساز باز کرتا رہا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تحمل سے کام لیتے رہے، تاہم اب اس نے ناقابل معافی جسارت کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مقدمے کے سلسلے میں اپنے ہاں بلایا اور گفتگو کے دوران آپ کے قتل کی سازش کی، راز فاش ہو جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آناً فاناً مجاہدین کو طلب کیا اور ۱۲ ربیع الاول ۴ ہجری کو بنو نضیر کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا، ۲۳ دن بعد بنو نضیر نے ہتھیار ڈال دیے، انہیں جلاوطنی کی سزا دی گئی، ان میں سے کچھ نے مدینہ کے شمال مشرق میں ۹۰ میل (۱۴۴ کلومیٹر) دور واقع خیبر کا رُخ کیا اور کچھ سرحدات شام چلے گئے"۔ ③

---

① دیکھیں: قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم، صفحہ ۱۵۱.
② تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۶۶۴.
③ حوالہ مذکورہ ص ۲۸۰.

نتیجہ:

اسماعیل ریحان صاحب نے ج ا ص ۲۸۰ پر غزوہ بنونضیر کی جو تفصیل لکھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنونضیر کا ۲۳ دن تک محاصرہ کیا گیا، اور پھر ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں قتل نہیں کیا گیا بلکہ جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

جبکہ ج ا ص ۶۶۴ پر لکھتے ہیں کہ بنونضیر کا سردار "حُیی بن اخطب" غزوۂ بنو نضیر میں ہی قتل ہوا تھا۔

اب ملاحظہ فرمائیں عجوبہ، جب غزوہ بنونضیر سنہ ۴ ہجری میں ہوا، اور اسماعیل ریحان صاحب کی "مستند ترین" سمجھی جانے والی تاریخ کے مطابق اسی غزوہ میں "حُیی بن اخطب" قتل ہوا تھا تو، نتیجہ یہ نکلا کہ "حُیی بن اخطب" سنہ ۴ ہجری میں قتل ہو چکا تھا۔

اب غور فرمائیں، سنہ ۵ ہجری میں ہونے والے غزوہ خندق کے حالات بیان کرتے ہوئے جناب اسماعیل ریحان لکھتے ہیں:

> "مدینہ میں اب یہودیوں کا فقط ایک قبیلہ بنوقریظہ باقی رہ گیا تھا اور شہر کے اندر وہی مسلمانوں پر کاری ضرب لگا سکتا تھا، ادھر قریش نے بنو قریظہ کو بغاوت کی ترغیب دینے کے لیے بنونضیر کے رئیس حُیی بن اخطب کو خفیہ طور پر روانہ کیا جس نے جا کر بنوقریظہ کو جنگ پر ابھارا، انہوں نے شروع میں انکار کیا مگر جب حُیی بن اخطب نے یقین دلایا کہ قریش اور اس کے اتحادی اس بار مسلمانوں کا صفایا کر کے ہی دم لیں گے تو بنوقریظہ نے اتحادیوں میں شامل ہونے کی حامی بھر لی"۔ ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۲۹۱.

یہاں جناب "مؤرخ اسلام" صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ سنہ ۵ ہجری میں ہونے والے غزوۂ خندق میں "بنونضیر کا رئیس حُیی بن اخطب" قریش کے کہنے پر بنوقریظہ کو بغاوت کی ترغیب دے رہا تھا، جی ہاں وہی "حُیی بن اخطب" جو (نئی مستند ترین تاریخ کے مطابق) غزوہ خندق سے ایک سال پہلے ہی غزوہ بنی نضیر میں قتل ہو چکا تھا....

یہ سوال ابھی تک تشنہ ہے کہ اپنے قتل کے ایک سال بعد "حُیی بن اخطب" دوبارہ زندہ ہو کر آ گیا تھا یا اس کی روح بنوقریظہ کو بغاوت پر آمادہ کرنے آ گئی تھی؟؟

سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ، مہاجر یا انصاری؟ جناب اسماعیل ریحان صاحب کا ایک اور "تجدیدی کارنامہ":

جناب اسماعیل ریحان صاحب غزوہ بدر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی کہ تجارتی قافلہ بچ کر نکل گیا ہے اور قریش کا مسلح لشکر مقابلے کے لیے آیا چاہتا ہے تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین نے اپنی جان نچھاور کرنے کا عزم ظاہر کیا، مگر آپ انصار کا جذبہ دیکھنا چاہتے تھے، انصار آپ کو اس وعدے پر لائے تھے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے جس کا مفہوم مدینہ کی حدود میں تحفظ فراہم کرنا تھا، کھلے لفظوں میں یہ معاہدہ نہیں تھا کہ اگر مدینہ سے باہر قریش سے جنگ ہوئی تو انصار اس وقت بھی مدد کے پابند ہوں گے، اس لئے آپ

انصار کی رائے کے منتظر رہے، قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آپ کی منشا سمجھ گئے اور اٹھ کر کہنے لگے:

" آپ شاید ہماری رائے جاننا چاہتے ہیں، اللہ کے رسول! آپ جس سے چاہیں صلح کریں، جس سے چاہیں لڑیں، ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں اللہ کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

ایک اور انصاری سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

" یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل نہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو، نہیں، ہم تو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے لڑیں گے"۔ ①

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے اس بات کے لیے حاشیہ میں سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۶۱۵ کا حوالہ دیا ہے۔

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب فرمایا تو سب سے پہلے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین نے اپنی جان نچھاور کرنے کا عزم ظاہر کیا۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار سے کچھ سننا چاہتے تھے، چنانچہ انصار میں سے پہلے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

ان کے بعد ایک اور" انصاری صحابی" سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا، یعنی اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ سیدنا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۲۴۱.

مقداد رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوہ بدر کے موقع پر مندرجہ بالا الفاظ کے ساتھ اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا، ایک انصاری صحابی تھے۔

دوستو! آپ تراجم صحابہ رضی اللہ عنہم یا سیرت و مغازی کی کوئی بھی کتاب اٹھا لیں، اور" مقداد بن عمرو" (جو مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں) کا تعارف پڑھیں، ان کے تعارف میں آپ کو کچھ یوں ملے گا:

"وأسلم قديما، وتزوج ضباعة بنت الزّبير بن عبد المطّلب ابنة عمّ النبيّ صلی اللہ علیہ وسلم، وهاجر الهجرتين، وشهد بدرا والمشاهد بعدها، وكان فارسا يوم بدر، حتى إنه لم يثبت أنه كان فيها على فرس غيره. وقال زرّ بن حبيش، عن عبد اللّٰه بن مسعود: أول من أظهر إسلامه سبعة، فذكر فيهم. ①

(آپ پرانے اسلام لانے والوں میں سے ہیں، آپ کی شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تایا زبیر کی بیٹی ضباعۃ کے ساتھ ہوئی تھی، آپ نے دونوں ہجرتیں کی ہیں (یعنی ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ ناقل) آپ غزوہ بدر اور اس کے بعد والے غزوات میں شریک ہوئے، غزوہ بدر میں صرف آپ ایک ہی تھے جو گھوڑے پر سوار تھے، زر بن حبیش نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنا اسلام ظاہر کیا وہ سات تھے، اور ان میں انہوں نے سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر کیا ہے)

نیز ان کا تعارف (اسد الغابۃ، ج ۵ ص ۲۴۲ دار الکتب العلمیۃ) پر بھی

---

① الاصابۃ، ج ٦ ص ١٥٩ ـ ١٦٠ دار الکتب العلمیۃ .

دیکھا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اس بات میں کوئی اختلاف یا غبار نہیں کہ وہ سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ جن کا غزوہ بدر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بھرپور حمایت کا اظہار بیان ہوا ہے وہ انصاری نہیں بلکہ مہاجر صحابی تھے۔

بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے سیرت ابن ہشام کی جس جلد اور صفحے کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے، اس میں بھی سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کو "انصاری" ہرگز نہیں لکھا ہوا، اور نہ ہی یہ لکھا ہے کہ "انصار میں سے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے اپنے رائے کا اظہار کیا"، بلکہ سیرت ابن ہشام کی عبارت یوں ہے:

(أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَالْمِقْدَادُ وَكَلِمَاتُهُمْ فِي الْجِهَادِ):

وَأَتَاهُ الْخَبَرُ عَنْ قُرَيْشٍ بِمَسِيرِهِمْ لِيَمْنَعُوا عِيرَهُمْ، فَاسْتَشَارَ النَّاسَ، وَأَخْبَرَهُمْ عَنْ قُرَيْشٍ، فَقَامَ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ، فَقَالَ وَأَحْسَنَ. ثُمَّ قَامَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَقَالَ وَأَحْسَنَ، ثُمَّ قَامَ الْمِقْدَادُ بْنُ عَمْرٍو فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، امْضِ لِمَا أَرَاكَ اللَّهُ فَنَحْنُ مَعَكَ، وَاللَّهِ لَا نَقُولُ لَكَ كَمَا قَالَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ لِمُوسَى: اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا، إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ. وَلَكِنْ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا مَعَكُمَا مُقَاتِلُونَ.... الخ" ①

(خلاصہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قریش ایک لشکر لے کر آ رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ فرمایا، تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

① سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱ صفحہ ۶۱۵ طبع مصطفی البابی، مصر۔

کھڑے ہوئے اور آپ نے اچھی بات فرمائی، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور آپ نے بھی اچھی باتیں کیں، پھر مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم بنی اسرائیل نہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو، نہیں، ہم تو آپ کے ساتھ مل کر لڑیں گے..)

اس کے بعد سیرت ابن ہشام میں عنوان ہے "اسْتِيثَاقُ الرَّسُولِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ أَمْرِ الْأَنْصَار" اور پھر یہ ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی رائے بھی سننا چاہتے تھے اور اس میں سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی بات کا ذکر ہے، اور اس مقام پر کہیں بھی ذکر نہیں کہ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بعد کسی" مقداد" نامی" انصاری صحابی" نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

یوں اسماعیل ریحان صاحب نے خود سیرت ابن ہشام کی جس جلد اور جس صفحے کا حوالہ دیا ہے وہیں صاف طور پر سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کا ذکر سیدنا ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ ہے یعنی مہاجرین کے ساتھ، لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے نہ جانے کس وجہ سے انھیں مہاجرین سے نکال کر انصار میں ڈال دیا؟

یاد رہے! اسی سیرت ابن ہشام میں ہجرت کے پہلے سال بھیجے جانے والے ایک" سریہ" کا ذکر ہے، جسے" سریہ عبیدۃ بن الحارث" کہا جاتا ہے، اور اس کے ضمن میں لکھا ہے کہ اسی سریے کے دوران ہی سیدنا مقداد بن عمرو (جنہیں مقداد بن الاسود بھی کہا جاتا ہے) مشرکین سے بھاگ کر مسلمانوں سے آملے تھے (کیونکہ کفار مسلمانوں کو ہجرت نہ کرنے دیتے تھے تو انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ مکہ سے کفار کے لشکر کے ساتھ چلے اور موقع ملتے ہی مسلمانوں کے ساتھ آملے ناقل)،

لکھا ہے:

مَنْ فَرَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ إِلَى الْمُسْلِمِينَ : ثُمَّ انْصَرَفَ الْقَوْمُ عَنْ الْقَوْمِ، وَلِلْمُسْلِمِينَ حَامِيَةٌ. وَفَرَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (إِلَى) الْمُسْلِمِينَ الْمِقْدَادُ بْنُ عَمْرٍو الْبَهْرَانِيُّ، حَلِيفُ بَنِي زُهْرَةَ". ①

اور اس سریہ کا ذکر خود اسماعیل ریحان صاحب نے اپنی کتاب میں یوں کیا ہے:

" جہاد کی پہلی مہم ہجرت کے سات مہینے بعد ماہ رمضان میں سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کی گئی، اس دستے میں تیس مہاجرین شامل تھے اور اس کا ہدف قریش کا ایک قافلہ تھا جو ابوجہل کی قیادت میں مدینہ کی شاہراہ سے کترا کر ساحلی سڑک سے شام جا رہا تھا مسلمانوں نے سامنے آکر اس قافلے کو متنبہ کرنے پر اکتفا کیا، دوسری مہم شوال میں سیدنا عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بطن رابغ کی طرف بھیجی گئی جہاں ابوسفیان کی قیادت میں ایک تجارتی قافلہ آ رہا تھا، اس مہم میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جنہوں نے کفار پر ایک تیر چلایا، یہ پہلا تیر ہے جو اسلام کی تاریخ میں حریف پر چلایا گیا اس بار بھی قافلے کو صرف ہراساں کرنا کافی سمجھا گیا"۔ ②

---

① سیرۃ ابن ھشام، ج ۱ ص ۵۹۲ طبع مصر .

② تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۲۳۶۔۲۳۷.

امام طبری اور عباسی خلیفہ "القاہر باللہ"، اور اسماعیل ریحان صاحب کی "مستند ترین" تاریخ:

جناب اسماعیل ریحان صاحب، مشہور مؤرخ و مفسر ابن جریر طبری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امام طبری رحمہ اللہ، معتمد عباسی کے دور میں بغداد آ کر بسے تھے، پھر انہوں نے مُعتضِد، مُکتفی، مُقتدِر اور قاہر جیسے خلفاء کا دور بھی دیکھا..." ①

غور کریں! یہاں اسماعیل ریحان صاحب بتا رہے ہیں کہ امام طبری، عباسی خلیفہ معتمد کے دور میں بغداد آئے اور پھر انہوں نے مزید چار عباسی خلفاء (معتضد، مکتفی، مقتدر اور قاہر) کا دور خلافت بھی دیکھا، ان خلفاء میں آخری نام اسماعیل ریحان صاحب نے "قاہر" کا ذکر کیا ہے جس کا لقب "القاہر باللہ" تھا، اور خود اسماعیل ریحان صاحب نے اس کا دور خلافت یوں بتایا ہے:

"القاہر باللہ شوال ۳۲۰ ہجری تا جمادی الآخرہ ۳۲۲ ہجری نومبر ۹۳۲ء تا جون ۹۳۴ء" ②

یعنی وہ بتا رہے ہیں کہ "القاہر باللہ" (جس کا نام محمد احمد المعتضد تھا) شوال ۳۲۰ ہجری میں تخت خلافت پر بیٹھا تھا۔

اور امام ابن جریر طبری کی وفات کے بارے میں اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یوں بتاتے ہیں:

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۷۸۔
② حوالہ مذکورہ ص ۶۶۱۔

" علالت کے بعد اتوار ۲۷ شوال ۳۱۰ ہجری کو علم وفضل کا یہ آفتاب دنیائے فانی سے رخصت ہوا"۔ ①

اب اگر واقعی امام طبری کی وفات سنہ ۳۱۰ ہجری میں ہو چکی تھی، تو انہوں نے اپنی وفات کے دس سال بعد یعنی ۳۲۰ ہجری میں تخت نشین ہونے والے عباسی خلیفہ" قاہر" کا دور خلافت کیسے دیکھا؟؟ کیا امام طبری دوبارہ زندہ ہو کر آئے تھے؟

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۸۳.

کیا یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بے ادبی و گستاخی تو نہیں؟
اہل علم سے ایک سوال

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں: (خلاصہ پیش خدمت ہے)

"سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی کا سب سے کٹھن، صبر آزما اور اعصاب شکن امتحان کوفہ کے بعض ایسے بزرگوں کی مرکز گریزی کی شکل میں سامنے آیا جنہیں صحبت نبوی کا شرف حاصل تھا، ان میں سیدنا عمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ بھی تھے ..... ان کے رئیس سیدنا حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ تھے .... سازشی گروہ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر یہ حضرات کوفہ میں بدامنی کے مرتکب ہوئے تھے ..." ①

آگے ایک جگہ جناب اسماعیل ریحان صاحب "فتنہ پرور لوگوں کے حلقے کے اثرات" کی سرخی لگا کر لکھتے ہیں:

"اس کے بعد تو سیدنا حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو بالکل پُر امن ہونا چاہیے تھا مگر وہ ان فتنہ پرور لوگوں کے حلقے سے باہر نہ نکل پائے جن کا مقصد شر انگیزی تھا...."

نیز لکھتے ہیں:

"گویا یہ مسلمانوں کا وہ سادہ لوح گروہ تھا جو دراصل سبائیوں کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا، سیدنا حُجر اور سیدنا عمرو بن بن حمق رضی اللہ عنہما حسنِ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۰۳.

ظن اور غلط فہمی کی وجہ سے ان لوگوں کی سرپرستی کر رہے تھے، ان بزرگوں کے اخلاص، علم، اور للّٰہیت میں کسی کو کوئی شک نہ تھا، مگر ان کی سرگرمیاں امت کی سلامتی کے لیے خطرناک تھیں یہی وجہ تھی کہ امت کے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین اور خود حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما، ان کے لئے محبت اور عزت و احترام کے جذبات رکھنے کے باوجود ان سرگرمیوں میں ان کی حمایت نہ کر سکے"۔ ①

اور یہی اسماعیل ریحان صاحب ہمیں" سبائی تحریک" کا تعارف کرواتے ہوئے، ایک جگہ" سبائی تحریک کے اجزائے ترکیبی" کے زیر عنوان، لکھتے ہیں: (خلاصہ پیش خدمت ہے)

" کچھ لوگ اس تحریک کے اصل منصوبہ ساز تھے یہ یہودی تھے جو شروع سے اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں مصروف رہے تھے، ان میں سے صرف عبد اللہ بن سبا کا نام ملتا ہے ..... دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کی طبیعت باغیانہ تھی ..... تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو دین داری کے غرور و تکبر کا شکار تھے، یہ لوگ بعد میں خوارج کے نام سے مشہور ہوئے ..... تحریک میں شامل چوتھی قسم کے لوگ وہ تھے جنہیں حکومت نے کسی جرم پر سزا دی تھی اب وہ انتقام لینے کے لیے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے ..... پانچویں قسم کے لوگ وہ تھے جو دولت کے بھوکے تھے ..... کچھ وہ نوجوان تھے جو من پسند عہدہ نہ ملنے کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے .....

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۰۶.

باقی سادہ لوگ عوام تھے جو کسی بھی پکار پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں.....
سبائی سازش کا اصل مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانا تھا.....سبائی مہم کے اثرات فقط رفض کی شکل میں نہیں ابھرے بلکہ اگلے دور میں شام، عراق اور بحرین کے بعض شہروں میں بنو ہاشم اور سادات سے نفرت کی جو فضا قائم ہوئی (جس نے کہیں ناصبیت اور کہیں خارجیت کا رنگ اختیار کیا) وہ بھی سبائی سازش ہی کا بالواسطہ نتیجہ تھی"۔ ①

اور اس سے پہلے آپ ہمیں" سبائی مہم اور اسلامی امراء کی کردار کشی" کے زیر عنوان یہ بتا چکے ہیں کہ:

" شورش پسند سبائی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی، خلافت کو کمزور بلکہ پارہ پارہ کرنا اور مسلمانوں کو لڑانا اس کا ہدف تھا، ملک کے اہم ترین امراء کی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے رشتہ داری کو ان بدبختوں نے اپنے مکروہ پروپیگنڈے کا بہانہ بنالیا"۔ ②

نیز اسماعیل ریحان صاحب آگے" ابن سبا کا نیا کھیل" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

" اگلے مرحلے میں عبداللہ بن سبا کے گروہ نے میڈیا مہم چلائی، ہر شہر کے سازشیوں نے دوسرے شہر کے لوگوں کے نام جھوٹے خطوط لکھے جن میں حکومت (یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت۔ ناقل) کے جبر وتشدد اور عوام کی مظلومیت کے افسانے تھے"۔ ③

اور پھر اسماعیل ریحان صاحب نے اسی سبائی تحریک کی طرف اشارہ

① ملخصاً: تاریخ ملت اسلامیہ، ج ۲ ص ۱۱۲۔ ۱۱۳.
② حوالہ مذکورہ ص ۱۰۷.
③ حوالہ مذکورہ ص ۱۱۸.

کرتے ہوئے عنوان باندھا ہے" سازشی تحریک کا تیسرا رُخ: سانحۂ شہادت"، اور لکھا ہے:

" باغی خلیفہ سے استعفاء لینے میں ناکام ہو چکے تھے اس لئے سازشی منصوبے کے تیسرے رُخ کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا گیا، طے ہوا کہ مکان پر اچانک دھاوا بول کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا جائے"۔ ①

اور پھر آگے ایک جگہ عنوان باندھا:

" سبائیوں کا قاتلانہ حملہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت" ②

اور خلیفہ راشد ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور آپ کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

" اگر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہونا کسی صحیح روایت سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس سے ان حضرات کی عدالت مجروح نہیں ہوتی، کیونکہ اتنے بڑے فتنے میں بشری عوارض کی بناء پر وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے، علمائے اسلام صحابہ رضی اللہ عنہم کی معصومیت کے قائل نہیں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطائیں ہوئی ہیں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض معاصی کا صدور بھی ثابت ہے. ہم یقیناً اس بات کے مکلف نہیں کہ محض عقیدت کی وجہ سے ان کی کسی ثابت شدہ غلطی کی تردید کردیں اور اسی لئے ہم حدود و قصاص سے

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۴۱.
② حوالہ مذکورہ ص ۱۴۵.

متعلقہ ان صحیح احادیث کو یقیناً مانتے ہیں جن میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی جنایات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ان پر حد جاری ہوئی مگر اس سے بھی ان حضرات کی عدالت مجروح نہیں ہوگی.....الخ" ①

ہمارا سوال:

جناب اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک حجر بن عدی اور عمرو بن الحمق، دونوں "صحابی" ہیں، جیسا کہ ان کی عبارت سے بھی ظاہر ہے، لیکن وہ ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ:

۱۔ یہ دونوں صحابی سازشی گروہ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر کوفہ میں بدامنی کے مرتکب ہوئے تھے۔

۲۔ یہ دونوں صحابی، ان فتنہ پرور لوگوں کے حلقے میں شامل تھے جن کا مقصد شر انگیزی تھا۔

۳۔ یہ دونوں صحابی، اس گروہ کی سرپرستی کر رہے تھے جو سبائیوں کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا۔

۴۔ یہی وجہ تھی کہ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما سمیت صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی اکثریت نے ان دونوں کی سرگرمیوں کی حمایت نہ کی۔

۵۔ اور سبائی تحریک کے اجزائے ترکیبی اور اس تحریک کا مقصد اسماعیل ریحان صاحب پہلے خود تفصیل سے بتا چکے ہیں، اور اب ہمیں بتا رہے ہیں کہ حجر بن عدی اور عمرو بن الحمق جیسے "صحابی" اسی سبائی تحریک میں شامل لوگوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۲۲.

پوچھنا صرف یہ تھا کہ .. مندرجہ بالا عبارات کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں کسی قسم کی" صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں بے ادبی" یا "تنقیص" تو نہیں جھلکتی ؟؟

اور کیا اگر ایسے ہی الفاظ یا اس سے ملتے جلے الفاظ میں ایسا ہی تجزیہ کوئی دوسرا محقق انہی دو صحابیوں میں سے کسی کے بارے میں یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور صحابی یا تابعی یا کسی اور بزرگ کے بارے میں کرے اور یوں کہے کہ:

" فلاں فلاں صحابی یا فلاں فلاں تابعی، سبائی سازشیوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گئے تھے اور جانے انجانے میں یا شعوری و لا شعوری طور پر سبائی گروہ کی سرپرستی کر رہے تھے، یا سبائی پروپیگنڈے سے متأثر ہو گئے تھے اور بدامنی پھیلانے یا حکومت وقت کے خلاف خروج کے مرتکب ہوئے تھے، ان کی سرگرمیاں امت کی سلامتی کے لئے خطرناک تھیں، اسی لئے اس وقت موجود اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نے ان کی سرگرمیوں کی حمایت نہ کی"۔

اور پھر ساتھ یہ شخص دلیل کے طور پر ان احادیث کا حوالہ بھی دے جن میں بیان ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسی معاصی اور جنایات کا صدور بھی ہوا جن کی وجہ سے ان پر حد جاری ہوئی، لہٰذا میرے یہ سب کچھ کہنے سے کسی صحابی کی عدالت پر کوئی فرق نہیں آتا، اور نہ ہی ایسا کہنے سے کسی بھی صحابی کی تنقیص یا اس پر تنقید شمار ہوتی ہے تو اس پر کوئی فتویٰ تو نہیں لگایا جائے گا ؟؟ بینوا توجروا.

بنی امیہ دشمنی اور اسماعیل ریحان صاحب

سیدنا حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم نے جہاں تک دیکھا بھالا ہے یہ شخصیت بھی مروان ہی کی طرح مشکوک ہے، فن رجال کے ائمہ میں سے کسی نے بھی حکم بن ابی العاص کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ نہیں کیا، بلکہ احتیاط برتتے ہوئے فقط رؤیت یا ادنی صحبت کا قول کیا ہے۔''①

آگے حافظ ذہبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''حکم بن ابی العاص بن امیہ، ابو مروان، ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا چچا زاد، کنیت ابو مروان، فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہے، صحبت کا تھوڑا سا حصہ ملا۔''②

یہاں اسماعیل ریحان صاحب، سیدنا حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں اعتراف کر رہے ہیں کہ علماء فن رجال نے ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت یا ادنی صحابیت حاصل ہے، حافظ ذہبی نے بھی صحبت کا لکھا ہے۔

اور دوسری طرف ایک شخصیت ''عبداللہ بن مطیع'' ہے جن کے بارے میں علماء فن رجال نے ''له رویة'' لکھا ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت بہت

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۰۳۲.

چھوٹے بچے بتائے جاتے ہیں، لیکن یہ مؤرخ اسلام صاحب عبد اللہ بن مطیع کو ''مشہور صحابی'' لکھتے ہیں۔ ①

اگر عبد اللہ بن مطیع ''مشہور صحابی'' ہو سکتے ہیں تو حکم بن ابی العاص کی صحابیت کا انکار بھی کسی نے نہیں کیا بلکہ ان کی صحبت کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے، پھر کیا یہ اسماعیل ریحان صاحب کی اپنی اوقات سے بڑھ کر چھلانگ نہیں کہ وہ ایک صحابی کو مشکوک بتائیں؟

اگر حکم بن ابن العاص رضی اللہ عنہ کو علماء نے صحابی تسلیم کیا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے جو تعظیم کو تکریم ہے وہ تو دینی پڑے گی.. ہاں اگر مؤرخ صاحب کو حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار ہے تو یہ صاف طور پر لکھنا چاہئے تھا تا کہ پھر اس پر بات ہوتی... لیکن صحابی مان کر یہ لکھنا کہ" میں نے جہاں تک دیکھا بھالا ہے یہ شخصیت مشکوک ہے" یہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ والی بات ہے، مؤرخ صاحب کی اتنی حیثیت نہیں کہ وہ ایک صحابی پر یوں تبصرے کرتے پھریں۔

یوں تو امام اہل سنت اور مجتہد سمجھی جانے والی شخصیت ابوبکر جصاص نے تو سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے سارے گروہ کے ایمان کو بھی مشکوک بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے دل کفر سے صاف نہیں ہوئے تھے۔ تو مؤرخ صاحب ان کا حوالہ دے کر قصہ ہی ختم کر ڈالتے تو بھی الگ بات ہوتی۔

معاف کیجیے گا! اگر اسماعیل ریحان صاحب، ادنی سے صحابی کو بھی ''مشکوک'' لکھیں گے تو ہمارے نزدیک یہ خود مشکوک قرار پائیں گے۔ اور ہم اس بات کے دلائل رکھتے ہیں۔

---

① دیکھیں تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۰۹.

کیا خروج اور بغاوت کی سزا کے طور پر قتل کرنا جائز نہیں؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب، اصحاب جمل وصفین کے بارے میں خود ہی ایک سوال کرتے ہیں اور پھر اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمہور فقہاء کی رائے میں کسی علاقے پر کنٹرول قائم کرنے والے لوگ چاہے خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کریں اور چاہے جائز مطالبہ لے کر ہی کھڑے ہوں تب بھی ان کا عمل خروج کہلائے گا، خود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اور عمل بھی اسی کے مطابق تھا، سیدنا حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ (اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک یہ صحابی ہیں۔ناقل) نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انہیں معزول کرنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ میں اپنی بیعت پر قائم ہوں، مگر انہوں نے ایک مسلح جماعت کے ساتھ ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومتی مشینری کو بے بس کر دیا تھا، اس لئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر خروج کا اطلاق کیا اور ان کے مقام کا لحاظ کیے بغیر انہیں ان کے متعدد رفقاء سمیت سزائے موت دی تاکہ ملک کا نظم وضبط متأثر نہ ہو"۔ ①

اس اقتباس میں اسماعیل ریحان صاحب اپنے اس موقف کو درست ثابت

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۸۶.

کرنے کے لئے کہ" کسی علاقے میں مسلح جماعت کے ساتھ حکومتی مشینری کو بے بس کرنے والے لوگ چاہے خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کریں اور چاہے جائز مطالبہ لے کر ہی کھڑے ہوں، تب بھی ان کا یہ عمل خروج (جسے بغاوت بھی کہتے ہیں۔ناقل) کہلائے گا"، اور پھر دلیل کے طور پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلہ اور عمل پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے (اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک ایک صحابی) حُجر بن بن عدی اور ان کے متعدد ساتھیوں کو ایسے ہی خروج پر سزائے موت دی تھی۔

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے اپنے اسی موقف کے حق میں عبدالملک بن مروان کے دور میں عبدالرحمٰن بن اشعث کے خروج کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا مطالبہ صرف حجاج بن یوسف کو معزول کرنے کا تھا کیونکہ وہ ظالم اور خلاف شرع کام کرتا تھا (جبکہ عبدالرحمٰن بن اشعث کے خروج کی وجہ خود اسماعیل ریحان صاحب ایک جگہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ حجاج کے حکم سے خراسان میں بغاوت کچلنے بھیجا گیا تھا، اور ایک مقام پر اس نے پیش قدمی روک دی تو حجاج نے اسے لکھا کہ وہ رکے نہیں بلکہ آگے بڑھے، تو اس حکم پر ناراض ہو کر اس نے بغاوت کر دی۔ دیکھیں: ج ۳ ص ۵۴۔۵۵۔ناقل)، بہرحال اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

> "ایسے ظالم کی معزولی کا مطالبہ جس قدر بجا تھا وہ سب پر عیاں ہے، مگر عبدالملک نے مطالبہ کرنے والوں کی کوشش کو خروج اور بغاوت ہی تصور کیا (اسماعیل ریحان صاحب نے بھی اسے" عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کی بغاوت" ہی لکھا ہے، ج ۳ ص ۵۴۔ناقل) اور فوجی

کاروائی کرائی جس میں ہزاروں آدمی مارے گئے، یہاں تک کہ ابن اشعث کی طاقت ختم ہوگئی، وہ مفرور ہوکر قتل ہوا، سعید بن جبیر رحمہ اللہ جیسے عظیم فقیہ اور محدث کو اسی خروج کی پاداش میں قتل کیا گیا"۔ ①

اس اقتباس میں اسماعیل ریحان صاحب نے خلیفہ عبد الملک بن مروان کے اس عمل کو اپنے موقف کے حق میں پیش کیا ہے، اور پھر آگے غور سے پڑھیں، لکھتے ہیں:

"فقہاء کی غیر جانب داری اور انصاف پسندی ملاحظہ ہو کہ یہاں شخصیات کی بجائے شریعت کو کسوٹی بنا کر ابن اشعث اور اس کے رفقاء کی مہم پر خروج کا اطلاق کیا، حالانکہ ان رفقاء میں امام شعبی، سعید بن جبیر، حسن بصری، مالک بن دینار، نضر بن انس بن مالک، ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، عطاء بن سائب، عبد الرحمٰن بن ابی لیلی اور عبد الرحمٰن بن شداد رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر تابعین فقہاء اور محدثین شامل تھے، اور یہ حضرات خلیفہ کے اقتدار کے مخالف نہ تھے، پس خروج کی تعریف میں خلیفہ کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی شرط شامل کردی جائے تو عبد الملک اور اس سے پہلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام آئے گا کہ انہوں نے غیر باغی پر باغی کی سزا جاری کی"۔ ②

اس اقتباس میں اسماعیل ریحان صاحب ہمیں بتاتے ہیں کہ فقہاء کرام نے عبد الرحمٰن بن اشعث اور ان کے ساتھیوں کے اس عمل کو "خروج" ہی کہا ہے، اگرچہ اس خروج میں بہت سے نامور تابعین بھی شامل تھے، اور اسماعیل ریحان

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۸۶۔۷۸۷۔
② حوالہ مذکورہ ۷۸۷۔

صاحب نے فقہاء کرام کی تعریف کی ہے کہ انہوں نے شخصیات کے بجائے شریعت کو کسوٹی بنایا۔

نیز اسماعیل ریحان صاحب نے آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ دیکھو اگر ہم یہ کہیں کہ حُجر بن عدی اور عبدالرحمٰن اشعث اور ان کے ساتھیوں نے چونکہ خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ صرف گورنروں کی معزولی کا مطالبہ کر کے مسلح خروج کیا تھا، لہٰذا ان کا یہ عمل بغاوت نہیں کہا جا سکتا، تو اس صورت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان پر الزام آئے گا کہ انہوں نے "غیر باغیوں" پر "باغیوں" کی سزا (یعنی قتل۔ ناقل) جاری کی، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان نے جن کو سزا دی وہ واقعی بغاوت کے مرتکب تھے۔

یاد رہے! سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبد الملک بن مروان کے اس فیصلے کو اسماعیل ریحان صاحب اپنے موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں، وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا عبدالملک بن مروان پر الزام نہیں لگا رہے اور نہ ہی اعتراض کر رہے ہیں، اور نہ ان کے اس فیصلے کو غلط بتا رہے ہیں۔

پھر اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

> "دیگر مسائل کی طرح اس قضیے میں بھی راہ نجات یہی ہے کہ ہم اسلاف پر اعتماد کریں، ان کی آراء قرآن وسنت کے عین مطابق ہیں، تحقیق کر کے ہر منصف مزاج عالم اسی نتیجے پر پہنچے گا"۔ ①

اور یہی اسماعیل ریحان صاحب اپنی اسی کتاب میں جا بجا ہمیں یہ باتیں بھی بتاتے ہیں:

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۸۷.

" شرعی احکام میں اللہ نے کسی بشر کو مستثنیٰ نہیں رکھا، رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف عملاً بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر بعض حدود نافذ کیں بلکہ قولاً بھی فرما دیا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔ ①

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"..یہ طے ہے کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کے مطابق ظالم و فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھنا شرعاً درست نہ تھا.." ②

(جبکہ وہ یقیناً سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان کو فاسق و ظالم نہیں کہتے ناقل)

اور ایک مقام پر لکھتے ہیں:

" اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمران کے ذاتی فسق کی وجہ سے خروج جائز نہیں ہوتا"۔ ③

اور

" جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم و ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے نزدیک خروج کا جواز یا وجوب کفر بواح (کھلم کھلا کفر) کے ارتکاب پر ہوا کرتا ہے"۔ ④

اور

"... دوسری صدی ہجری کے دوران اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہو گیا (جسے دوسرے لفظوں میں اجماع کہا جاتا ہے۔ ناقل) کہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۹۸.
② حوالہ مذکورہ ص ۵۵۰.
③④ حوالہ مذکورہ ۲۵۳.

حکام کے ظلم وستم پر صبر وتحمل کرنا اور خروج نہ کرنا واجب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کو بدلتا دیکھ کر فقہاء نے اپنے طور پر دین میں تبدیلی کر لی تھی اور یہ نئے احکام ایجاد کر لیے، ہرگز نہیں بلکہ یہ ہدایات قرآن وسنت کی نصوص میں پہلے سے موجود تھیں...الخ" ①

اور

" صرف معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں"۔ ②

اب آیئے دوسری طرف، ہمیں خود اسماعیل ریحان صاحب نے بتایا کہ فقہاء اسلام نے عبدالرحمٰن بن اشعث کے اس خروج کو بغاوت ہی کہا ہے اگرچہ اس کے ساتھ اس عمل میں کئی فقہاء ومحدثین بھی شریک تھے، لیکن فقہاء کرام نے شخصیات کے بجائے شریعت کو کسوٹی بنایا ہے، اور (بقول اسماعیل ریحان صاحب) شریعت کی رُو سے عبدالرحمٰن بن اشعث اور اس کے ساتھیوں کا یہ خروج بغاوت ہی تھا، اور اس بغاوت میں شریک ہونے والوں پر عبدالملک بن مروان نے قتل کی سزا نافذ کی، جسے اسماعیل ریحان صاحب نے غلط نہیں کہا بلکہ اسے اپنی دلیل میں پیش کیا ہے، لیکن جب یہی اسماعیل ریحان صاحب اپنی کتاب کی تیسری جلد میں عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں عبدالرحمٰن بن اشعث کی اس بغاوت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تو وہاں انہیں نہ فقہاء کی" غیر جانبداری وانصاف پسندی" یاد رہتی ہے اور نہ ہی" شخصیات کے بجائے شریعت کو کسوٹی

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۶۱۔ ۶۲.
② حوالہ مذکورہ ص ۶۳.

بنانے والی بات" ہی ان کے ذہن میں رہتی ہے، وہ اس واقعہ کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے ان باغیوں کے ساتھ ظلم کیا گیا اور انہیں ناحق سزا دی گئی، کچھ جھلکیاں پیش ہیں، وہ بتا رہے ہیں کہ آخری جنگ میں عبد الرحمٰن بن اشعث کو شکست ہوئی تو وہ فرار ہو کر خراسان چلا گیا اور ایک آتش پرست سردار رُتبیل کے پس پناہ لے لی، حجاج نے رُتبیل کو جنگ کی دھمکی دی جس کے بعد رُتبیل نے ابن اشعث کا سر قلم کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا، آگے لکھتے ہیں:

"ابن اشعث کو ٹھکانے لگانے کے ساتھ حجاج بن یوسف نے عراق میں حکومت کے باغیوں کو چن چن کر ختم کیا، جنگ کے بعد اس نے جن گرفتار شدگان کو قتل کرایا ان کی تعداد چار سے پانچ ہزار تک بتائی جاتی ہے"۔ ①

"ابن اشعث کے ساتھ خروج میں شریک بہت سے علماء دوران جنگ قتل ہوئے، بعض لاپتہ ہو گئے، کچھ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا، اور کچھ کو جان کی امان مل گئی"۔ ②

آگے لکھا:

"گرفتاری کے بعد قتل کیے جانے والوں میں عمران بن عصام الضبعی رحمہ اللہ بھی تھے جو بصرہ کے عابد و زاہد آدمی تھے، انہیں حجاج کے سامنے لایا گیا تو حجاج نے کہا: گواہی دو کہ تم نے کفر کا ارتکاب کیا، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ وہ بولے: واللہ جب سے اللہ کو مانا ہے، کبھی کفر

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۸.
② حوالہ مذکورہ ص ۵۹.

نہیں کیا، حجاج نے ان کی گردن کٹوا دی. حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

گرفتار شدگان میں سے جو کفر کا اقرار کرتا، حجاج اسے چھوڑ دیتا، ورنہ قتل کرا دیتا"۔ ①

ملاحظہ فرمائیں، ان باغیوں کو قتل کی سزا دینے پر پہلے اسماعیل ریحان صاحب عبدالملک بن مروان کے عمل کو اپنے حق میں پیش کر رہے تھے، اب انہی کے قتل کو ظلم و بربریت بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، اور اس کے لیے بے سند و بے سروپا باتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے، حجاج کے بارے میں جو یہ بات لکھی گئی ہے کہ اس نے عمران بن عصام الضبعی کو کفر کا اقرار کرنے کا کہا، نیز وہ باغی قیدیوں سے کہتا تھا کہ: کفر کا اقرار کرو، اور جو کفر کا اقرار کرتا تو اسے چھوڑ دیتا، ورنہ قتل کروا دیتا، اس کے لیے حوالہ کے طور پر "البدایة والنهایة" اور "سیر اعلام النبلاء" کو پیش کیا گیا ہے، ہم نے ان دونوں کتابوں کے مطلوبہ مقام غور سے دیکھے ہیں وہاں ان باتوں کی سرے سے کوئی سند منقول نہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ کسی اور کتاب میں اس کی کوئی صحیح سند ہے بھی یا نہیں؟، اگر ہوتی تو اسماعیل ریحان صاحب ضرور اس کتاب کا حوالہ دیتے جس میں اس بات کی کوئی صحیح سند بھی ہو، بلکہ اسماعیل ریحان صاحب نے آگے ایک جگہ کسی بھی کتاب کا حوالہ دیے بغیر یہ بھی لکھا ہے کہ:

"حجاج کے نظریات میں بے حد تشدد تھا، وہ حکومت سے بغاوت کو کفر کہتا تھا، اس کا باغی قیدیوں سے مطالبہ ہوتا تھا کہ ان کی توبہ تب قبول ہوگی جب کہ وہ اپنے اقدام کو کفر مانیں اور کفر سے توبہ کریں، اگر وہ خود کو مسلمان کہتے تو حجاج انہیں کفر و ارتداد کا مرتکب مان کر قتل کر دیتا

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۵۹.

تھا، اس عمل کے ظلم اور اس نظریے کے گمراہی ہونے میں کوئی شک نہیں"۔ ①

ظاہر ہے اتنے بڑے الزام کے لیے کسی معتبر اور مستند دلیل کا ہونا ضروری ہے، جب کہ اسماعیل ریحان صاحب نے اس بات کا کوئی مستند حوالہ نہیں دیا، بہر حال سر دست ہماری بحث اس سے نہیں۔

اب آگے دیکھئے اسماعیل ریحان صاحب ان" باغیوں" کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:

" اس میں شک نہیں کہ دیر جماجم (اس مقام پر عبدالرحمٰن بن اشعث کی باغی جماعت کے ساتھ خلیفہ عبدالملک بن مروان کی طرف سے نامزد گورنر عراق حجاج بن یوسف کی آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ ناقل) کے اکثر حریت پسند مخلص تھے، اللہ کے دین کو خالص خلافت راشدہ کے انداز میں نافذ کرنے کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چاہتے تھے.....ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں"۔ ②

اور ایک جگہ عبدالرحمٰن بن اشعث کی اس بغاوت میں شامل معروف تابعی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے قتل پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" جب باغیوں کی جمعیت منتشر ہو چکی ہو تو شریعت ایسی حالت میں باغی قیدیوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، یہاں بغاوت کچلی جا چکی تھی، لوگ منتشر ہو گئے تھے اس لئے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کوئی خطرہ نہ تھا، مگر حجاج نے انہیں اور اس طرح کے متعدد تابعین کو چن چن

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۱۱۷.
② حوالہ مذکورہ ص ۶۰.

کر قتل کرایا.." ①

غور فرمائیں! جن کے خروج کو اسماعیل ریحان صاحب کے اقرار کے مطابق فقہاء نے شخصیات کے بجائے شریعت کو کسوٹی بناتے ہوئے "بغاوت" ہی کہا، اور جن پر خلیفہ وقت نے سزا بھی نافذ کی اور اس سزا کے نفاذ کو اسماعیل ریحان صاحب اپنے موقف کی پہلے دلیل بھی بنا چکے (جس کا ذکر پہلے ہو چکا)، اسی بغاوت کے بارے میں اب فرماتے ہیں کہ" اسے جرم قرار دینا درست نہیں"، اور یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ" جب باغیوں کی بغاوت کچل دی جائے، اور ان کو شکست ہو جائے تو اس کے بعد بغاوت کے اس جرم میں شامل ہونے والوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں"....کیا وہ اب ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بنا کسی جرم کے ان خروج کرنے والوں پر قتل کی سزا نافذ کی اور انہیں ناحق قتل کیا گیا؟؟، کیا جب حجر بن عدی کو سزا دی گئی تو اس وقت بغاوت کچلی نہ جا چکی تھی، اور ان کی جمعیت منتشر نہیں ہو چکی تھی؟ اور کیا اسماعیل ریحان صاحب خود پہلے عبدالملک بن مروان کے عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت میں شامل لوگوں کو سزا کے طور پر قتل کرنے کے عمل کو اپنی دلیل میں پیش نہیں کر چکے؟ اور کیا وہاں وہ خاص طور پر یہ ذکر نہیں کر آئے کہ اسی جرم میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ کو بھی قتل کیا گیا؟..کیا وجہ ہے کہ جہاں اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم موقف صحابہ رضی اللہ عنہم کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے وہاں تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معاصی کے صدور اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر حدود کے نافذ کیے جانے کی مثالیں دیتے ہیں اور ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ احکام شریعت سے کوئی بشر بھی

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۱۱۷.

مستثنیٰ نہیں، لیکن یہاں وہ خروج و بغاوت کو" بہادری وحمیت کے لحاظ سے قابل فخر عمل" قرار دیتے ہیں اور اسے" جرم" قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، اور یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ" بغاوت میں شامل لوگوں کو بغاوت کے کچلے جانے کے بعد سزا کے طور پر قتل کرنے کی اجازت نہیں اور اسے ظلم قرار دیتے ہیں" ..یا للعجب.

اسماعیل ریحان صاحب
اور دور مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم

قارئین محترم! آج تک ہم یہی پڑھتے آئے ہیں کہ "مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم" کا دور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شروع ہوا، اور اسی دور میں جمل و صفین جیسے واقعات ہوئے، اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری (یعنی ۳۵ ہجری کے بالکل آخر میں) ہوئی، لیکن اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ "دور مشاجرات" کا آغاز سنہ ۳۴ ہجری (یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے سال بھر پہلے ہی ہو چکا تھا)، چنانچہ انہوں نے جلی حروف میں لکھا ہے:

"دور مشاجرات: ۳۴ تا ۴۰ ہجری" ①

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تاریخ اسلامی میں جب "مشاجرات" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد "مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم" ہی ہوتا ہے، یوں اسماعیل ریحان صاحب نے یہ تاثر دیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مشاجرات کا آغاز تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ کی شہادت سے سال بھر پہلے ہی ہو چکا تھا۔

دوسرے لفظوں میں دور مشاجرات کی ابتداء ۳۴ ہجری سے بتا کر اسماعیل ریحان صاحب نے ان لوگوں کے بیانیہ کی تائید کی ہے جو کہتے ہیں کہ خلیفہ راشد

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۸.

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک چلانے والے دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے (رافضی اور نیم رافضی اور آنجہانی مولوی اسحاق جھالوی وغیرہ کا بیانیہ یہی ہے)، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہی ان سے اختلاف کیا تھا، لہٰذا سارا الزام باہر سے آنے والے شر پسندوں پر دھرنا درست نہیں، انہیں شبہ تو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملی جن کا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں سے اختلاف ہوا تھا، ان شر پسندوں نے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان آپس میں ہونے والے" مشاجرات" سے ہی فائدہ اٹھایا۔

کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سنہ "۶۳ ہجری" میں زندہ تھے؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب "واقعہ حرہ" کا ذکر کرتے ہوئے پہلے عنوان باندھتے ہیں:

"واقعہ حرہ پر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تاثر"

اور پھر لکھتے ہیں:

"واقعہ حرہ پیش آیا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ تنبیہات یاد آگئیں، ان کے نزدیک یزید بن معاویہ ان وعیدوں کا مصداق تھا، مدینہ منورہ کے ثقہ راوی ابو عبداللہ قراظ سے مروی ہے کہ انہوں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یزید بن معاویہ کے بارے میں یہ کہتے سنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جو شخص اس شہر یعنی مدینہ کے باشندوں سے کسی برائی کا ارادہ کرے گا، اللہ سے یوں گھلا دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے"۔ ①

قارئین محترم! اسماعیل ریحان صاحب کی یہ عبارت مع عنوان دوبارہ پڑھیں، اس میں وہ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ:

نمبر ۱: واقعہ حرہ کے وقت یا اس کے ہو چکنے کے بعد سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ تاثر نقل کیا جا رہا ہے، عنوان دیکھیں اور پھر یہ عبارت دیکھیں کہ "واقعہ حرہ پیش آیا تو

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۲۳.

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ تنبیہات یاد آ گئیں"۔

نمبر ۲: ان بعض صحابہ (یعنی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ناقل) کے نزدیک اسماعیل ریحان صاحب کی محولہ بالا روایت میں مذکور وعید کا مصداق "یزید" تھا۔

نمبر ۳: جس روایت کی طرف اسماعیل ریحان صاحب نے اس مقام پر اشارہ کیا ہے، وہ اسی صفحے پر حاشیہ میں "مصنف عبدالرزاق" کے حوالے سے بیان کی ہے، اس میں عربی الفاظ ہیں (ابوعبداللہ القراظ کہتے ہیں کہ) "سمعتُ اباھریرۃ یقول لیزید بن معاویۃ....الخ"، ان عربی الفاظ کا ترجمہ بنتا ہے کہ: "میں نے سیدنا ابو ہریرہ کو سنا کہ وہ یزید سے یوں کہہ رہے تھے"... لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے جان بوجھ کر یہاں ترجمہ یوں کیا کہ "انہوں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے بارے میں یہ کہتے سنا"، یہ "یزید کے بارے میں" کے الفاظ عربی عبارت میں کن الفاظ کا ترجمہ ہے؟؟ وہاں تو "یقول لیزید بن معاویہ" کے الفاظ ہیں.. یہ ترجمہ تبدیل اس لیے کیا گیا کہ اسماعیل ریحان صاحب جانتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا انتقال تو یزید کے خلیفہ بننے سے بھی پہلے ہو چکا تھا پھر وہ واقعہ حرہ پر اپنا یہ تاثر کیسے دے سکتے ہیں؟؟

حقیقت یہ ہے کہ واقعہ حرہ سنہ ۶۳ ہجری میں ہوا، اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات تو یزید کے خلیفہ بننے سے بھی پہلے سنہ ۵۹ ہجری میں ہو چکی تھی، لہٰذا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ حرہ کے وقت یا واقعہ پیش آنے کے بعد اس پر اپنا تاثر دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، لہٰذا اسماعیل ریحان صاحب کا یہ لکھنا کہ:

"واقعہ حرہ پیش آیا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ

تنبیہات یاد آ گئیں" اور پھر بطور دلیل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ روایت پیش کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ جیسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ واقعہ حرہ کے وقت موجود تھے اور اس واقعہ کے بعد آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہات یاد آ گئیں..اور یہ بات عقلاً ونقلاً غلط ہے۔

پھر اس روایت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ بات سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہی تھی (نہ کہ اس کے بارے میں کہی تھی، جیسے اسماعیل ریحان صاحب نے غلط ترجمہ کیا ہے)، تو اگر اس بات کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یزید سے یہ بات کہنا، یقیناً سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے پہلے ہی ہوگا، اور آپ کی وفات بالاتفاق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی، یعنی اس وقت تک یزید ابھی تخت خلافت پر بیٹھا ہی نہ تھا..تو کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پہلے سے واقعہ حرہ کے بارے میں علم تھا جو بقول اسماعیل ریحان صاحب، انہوں نے" واقعہ حرہ پر اپنا تاثر" یزید کے خلیفہ بننے سے بھی پہلے اسے بتا دیا؟؟ یہ گتھی اسماعیل ریحان صاحب نے نہیں سلجھائی۔

دراصل اس روایت میں سرے سے واقعہ حرہ کا کوئی ذکر اذکار ہی نہیں، اور نہ ہی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ میں واقعہ حرہ کے بارے میں اپنا تأثر دے رہا ہوں..یہ سب باتیں اسماعیل ریحان صاحب کا اپنا استنباط ہیں اور کچھ نہیں۔

لہٰذا اسماعیل ریحان صاحب کی یہ روایت" درایتاً" کسی بھی طرح قابل قبول نہیں، ورنہ یہ بات ثابت کرنا ہوگی کہ کیا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یزید کہ خلیفہ بننے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ واقعہ حرہ ہوگا اور انہوں نے کئی برس پہلے ہی اپنا تأثر اس واقعہ پر دے دیا تھا اور (بقول اسماعیل ریحان) یزید کو اس حدیث کا

مصداق بھی قرار دے دیا تھا (جیسا کہ اسماعیل ریحان صاحب کا دعوی ہے)۔

اب آیئے اس روایت کی اسنادی حیثیت کی طرف، مصنف عبدالرزاق کی اس روایت کی سند میں ایک راوی ہے "**نجيح بن عبدالرحمٰن السندي ابو معشر المدني مولى بني هاشم**" خود اسماعیل ریحان صاحب نے مجبوراً اس کے بارے میں امام ثوری کا قول کہ "یہ لیّن الحدیث" ہے اور امام یحییٰ بن مَعین کا قول کہ "یہ ضعیف ہے" نقل کیا ہے ① ۔اور پھر صاف لکھا ہے کہ "اس میں کچھ ضعف ہے، اور ضعف بھی حافظے میں فرق کے باعث ہے" (جبکہ کچھ ضعف نہیں بلکہ ائمہ نے اس کے بارے میں "ضعیف ضعیف" دو بار بولا ہے) لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے اس راوی کو مقبول ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، کبھی کہتے ہیں کہ ان کا حافظے میں فرق کی وجہ سے جو ضعف ہے تو انہیں سہو صرف سندوں میں ہوتا تھا، متون میں نہیں ہوتا تھا وغیرہ.. لہٰذا اسماعیل ریحان صاحب فیصلہ دیتے ہیں کہ: "بہرکیف ابو معشر محدثین کے ہاں مقبول ہیں...ان کی روایت کو حسن کہا جا سکتا ہے"۔

قارئین محترم! چونکہ اسماعیل ریحان صاحب نے خود اسماء الرجال کی کتاب "**تهذيب الكمال**" ② کا حوالہ بھی یہاں دیا ہے، اس لیے ہم سر دست صرف اسی کتاب سے "ابو معشر" کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی وہ آراء نقل کرتے ہیں جو اسماعیل ریحان صاحب نے جان بوجھ کر نقل نہیں کیں:

عمرو بن علی کہتے ہیں کہ امام یحییٰ بن سعید، ابو معشر سے حدیث نہیں لیتے

---

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۵۲۳ حاشیہ۔

② جلد ۲۹ صفحہ ۳۲۶۔

تھے انہیں ضعیف سمجھتے تھے اور جب ان کا ذکر آتا تو ہنسا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل سے ابو معشر کی حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان کی حدیث میرے نزدیک مضطرب ہے، سند درست نہیں ہوتی، ہاں صرف لکھنے کی حد تک ان کی حدیث لکھ سکتے ہو۔

ایک اور جگہ امام احمد سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ابو معشر کی صرف وہ احادیث لکھی جائیں جو محمد بن کعب سے ہیں اور تفسیر سے متعلق ہیں۔

امام احمد کے بیٹے عبداللہ، امام یحییٰ بن معین سے ابو معشر کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: وہ حدیث میں قوی نہیں۔

احمد بن ابی یحییٰ، امام یحییٰ بن مَعین سے ناقل ہیں کہ: ابو معشر السندی کچھ بھی نہیں (**ليس بشيء**)۔

ابو بکر بن ابی خیثمۃ، یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں کہ آپ نے فرمایا: **أَبُو معشر السندي ليس بشيءٍ، أَبُو معشر ريح. قال: وسمعته مرة أخرى يَقُول: ليس حديثه بشيءٍ** .. ابو معشر السندی کچھ بھی نہیں، ابو معشر صرف ہوا ہے، اور ایک اور جگہ فرمایا: ان کی (روایت کردہ) حدیث کی کوئی حیثیت نہیں۔

احمد بن سعید بن ابی مریم، امام یحییٰ بن مَعین سے ناقل ہیں کہ آپ نے فرمایا: ابو معشر ضعیف ہیں، (اگر ان کی حدیث لکھنی ہی ہو تو) صرف "رقاق" سے متعلق احادیث لکھ سکتے ہیں (احادیث رقاق سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں دل نرم کرنے والی اور اللہ کا خوف پیدا کرنے والی باتیں ہوں، دوسرے لفظوں میں فضائل اعمال والی احادیث مراد ہیں۔ ناقل)

امام بخاری نے ابو معشر کو "منکر الحدیث" کہا۔

امام نسائی نے کہا کہ" وہ ضعیف ہے"۔

امام ابوداود نے بھی" ضعیف" کہا۔

صالح بن محمد الحافظ کہتے ہیں: **لا یسوی حدیثه شیئا..** ان کی حدیث کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔

محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ میں نے امام علی بن المدینی سے "ابومعشر" کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا: **"کان شیخا ضعیفا ضعیفا"**..وہ ضعیف تھے ضعیف تھے۔(دوبار ضعیف کہا)۔①

امام دارقطنی نے "ابومعشر" کو **"الضعفاء والمتروکین"** میں شمار کیا ہے۔②

ابن جوزی نے بھی" ابومعشر" کو **"الضعفاء والمتروکین"** میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے: **"وَقَالَ یحیی وَالنَّسَائِيّ والدراقطني ضَعِیف وَقَالَ یحیی مرّة لَیْسَ بِقَوي فِي الحَدِیث وَقَالَ البُخَارِيّ مُنکر الحَدِیث"** ..یحییٰ بن معین، نسائی اور دارقطنی نے انہیں ضعیف کہا ہے، اور یحییٰ بن معین نے ایک بار یوں کہا ہے کہ یہ حدیث میں قوی نہیں، اور امام بخاری نے انہیں **منکر الحدیث** کہا ہے۔③

ابونعیم اصبہانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے: **"نجیح أَبُو معشر السندي مدنِي مولی أم مُوسَی أم الْمهْدي أَمِیر الْمُؤمنِینَ روی عَن نَافِع**

---

①تهذیب الکمال في اسماء الرجال، ج۲۹ ص ۳۲۲ وما بعد، طبع مؤسسة الرسالة بیروت.

②الضعفاء والمتروکون للدارقطنی، ج۳ ص ۱۳۴، طبع المدینة المنورة.

③الضعفاء والمتروکون لابن الجوزي، ج۳ ص ۱۵۷ دار الکتب العلمیة—بیروت

وَابْن الْمُنْكَدر وَهِشَام بن عُرْوَة وَمُحَمّد بن عَمْرو الموضوعات لَا شَيْء" .. یہ نافع، ابن المنکدر، ہشام بن عروۃ اور محمد بن عمرو سے موضوع روایتیں نقل کرتے ہیں، یہ کچھ بھی نہیں۔ ①

قارئین محترم!

ہم نے مختصر طور پر "ابو معشر نجيح بن عبدالرحمٰن السندي" کے بارے میں علم اسماء الرجال کے چوٹی کے ائمہ کی آراء نقل کر دی ہیں، اگر کسی نے ان کی احادیث لکھنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی صرف فضائل اعمال سے متعلق (احادیث رقاق) لکھنے کی اجازت دی ہے یا محمد بن کعب سے تفسیری اقوال پر مشتمل روایت لکھنے کی، (اسماعیل ریحان صاحب نے امام یحییٰ بن معین کا ایک قول نقل کیا ہے کہ "ضعيف يكتب حديثه" (کہ وہ ضعیف ہے اس کی حدیث لکھ سکتے ہیں) لیکن یہاں ڈنڈی ماری ہے.. جبکہ درست اور مکمل الفاظ یوں ہیں "عَن يحيى بْن مَعِين: ضعيف، يكتب من حديثه الرقاق" (وہ ضعیف ہے، اور صرف رقاق سے متعلق اس کی حدیث لکھ سکتے ہیں) اسماعیل ریحان صاحب نے ایک تو "يكتب من حديثه" کو "يكتب حديثه" بنا دیا اور دوسرا "الرقاق" کا لفظ حذف کر کے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے جیسے اس کی ہر قسم کی حدیث لکھنے کی اجازت ہے... نیز آخری عمر میں ان کے حافظے میں شدید تغیر پیدا ہو گیا تھا۔

اور جناب اسماعیل ریحان صاحب خود یہ لکھ چکے ہیں کہ:

"...ثقاہت یا ضعف کا فیصلہ کسی ایک آدھ نقاد کی رائے سے نہیں ہوگا، بلکہ جمہور کی ان آراء سے ہوگا جنہیں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما

① الضعفاء لابي نعيم، ص ۱۵۳ طبع الدار البيضاء .

جیسے حضرات نے مرتب کیا ہے"۔ ①

لیکن یہاں وہ اپنا بیان کردہ یہ اصول بھول گئے اور "ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی" کو کھینچ تان کر مقبول ثابت کرنے کے چکر میں ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ اسی مصنف عبد الرزاق میں، اسماعیل ریحان صاحب کی پیش کردہ روایت سے پہلے یہی روایت دو دوسری سندوں کے ساتھ مروی ہے جن میں "ابن معشر" موجود نہیں، ایک سند یہ ہے:

"عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ يُحَنَّسٍ، عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ الْقَرَّاظِ، أَنَّهُ قَالَ: أَشْهَدُ عَلَى أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ: "قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أَرَادَ أَهْلَ هَذِهِ الْبَلْدَةِ بِسُوءٍ يَعْنِي الْمَدِينَةَ أَذَابَهُ اللهُ فِي النَّارِ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ".

اور دوسری سند یہ ہے:

"عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ عُمَارَةَ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا عَبْدِ اللهِ الْقَرَّاظَ، مِنْ أَصْحَابِ أَبِي هُرَيْرَةَ يَزْعُمُ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أَرَادَ أَهْلَهَا بِسُوءٍ أَذَابَهُ اللهُ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ"۔ ②

ان دونوں روایتوں میں سے پہلی روایت میں "ابوعبداللہ القراظ" سے

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۳۴۔

② مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر: ۱۷۱۵۴ اور ۱۷۱۵۵، ج ۹ ص ۲۶۳ طبع المجلس العلمي، الهند.

روایت کرنے والے "عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ یُحَنَّس" ہیں جو کہ صحیح مسلم کے راوی ہیں اور ثقہ ہیں، انہوں نے نہ "یزید بن معاویہ" کا نام ذکر کیا ہے اور نہ ہی اس سے یہ بات کہے جانے کا ذکر کیا۔

جبکہ دوسری روایت میں "ابو عبداللہ القراظ" سے روایت کر رہے ہیں "عَمْرُو بْنُ یَحْیَی بْنِ عُمَارَۃَ" یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں، اور ان کی روایت میں بھی "یزید بن معاویہ" کا کوئی ذکر نہیں۔

لہٰذا مجروح راوی ابو معشر کی روایت کے مقابلے میں "عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن یحنس" اور "عمرو بن یحیی بن عمارۃ" کی روایات کو ترجیح دی جائے گی کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صرف یہ ایک حدیث بیان فرمائی، اور اس میں کہیں بھی نہ واقعہ حرہ کا ذکر ہے اور نہ ہی یزید کا، اگر کوئی اسے واقعہ حرہ پر لگاتا ہے تو یہ اس کا اپنا استنباط ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو کہ یزید کے خلیفہ بننے سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے ان کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ انہوں نے واقعہ حرہ پر اپنا تاثر یوں بیان فرمایا تھا کسی طرح بھی درست نہیں۔

پھر یہ بات کہ "اہل مدینہ کے ساتھ برائی کا ارادہ" کس نے کیا؟ کون تھا جس نے اس شہر کے امن و امان کو خراب کیا؟، اگر اس کی تفصیل میں جایا جائے تو بات بہت دور تک جائے گی۔

یاد رہے! بفرض محال، ابو معشر کے ضعف کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر اسماعیل ریحان صاحب کی پیش کردہ روایت کی سند کو حسن بھی تسلیم کر لیا جائے تو چونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ واقعہ حرہ سے کئی سال پہلے وفات پا چکے تھے اس لیے ان کی اس روایت کو واقعہ حرہ کے ساتھ بطور خاص طور پر جوڑنا پھر بھی محل نظر ہے، اور

اس روایت کے عربی الفاظ سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ بات یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہی تھی، یہ بہت بعید ہے.. خود اسماعیل ریحان صاحب ایک جگہ ایک صحیح السند روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"امام شعبی کا یہ قول تو ثابت ہے مگر اسے من وعن حقیقت پر محمول نہیں کیا جاسکتا..... بہرکیف اس قول کو من وعن قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے"۔①

اسی طرح اسماعیل ریحان صاحب کا اس روایت کو واقعہ حرہ کے ساتھ جوڑنا جب کہ اس کا ایک راوی "ابو معشر" ضعیف بھی ہے، یہ سوائے سینہ زوری کے اور کچھ نہیں اور اسماعیل ریحان صاحب کی "جانبدارنہ" تحقیق کا کمال ہے۔

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۳۹.

پہلا اسلامی بحری بیڑہ اور قسطنطینیہ پر پہلا حملہ، اور اسماعیل ریحان صاحب کی تخلیق کردہ نئی تاریخ

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

" سن ۲۸ ہجری کے موسم بہار میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے سالار بحریہ عبداللہ بن قیس کے ساتھ شام کے ساحل عکا سے پہلا اسلامی بیڑہ لے کر سمندر کی موجوں میں اترے، ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت فاختہ بنت قُرضہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، اسی طرح حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ حضرت اُمّ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس تاریخی مہم میں شامل تھے"۔ ①

نوٹ: یہاں حاشیہ میں اسماعیل ریحان صاحب نے حوالہ دیا ہے" فتوح البلدان، ص ۱۵۳ ، ۱۵۴ مکتبۃ الہلال" کا، اور ذہن میں رہے کہ علامہ بلاذری رحمہ اللہ نے فتوح البلدان میں یہ بات" اُمر قبرص" یعنی قبرص کے معاملے یا قبرص کی فتح کے عنوان سے ذکر کی ہے، یہاں"قسطنطینیہ" کا کوئی ذکر نہیں۔

آگے لکھتے ہیں:

" یہ وہی جہاد تھا جس کے مناظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھائے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: میں نے اپنی امت کے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے وہ بحری جہازوں پر سمندر میں اس شان سے سفر کر رہے ہیں

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۶۰۹.

جیسے بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہو"۔ ①

نوٹ: اس کے لیے انہوں نے صحیح بخاری کی حدیث نمبر: ۲۷۸۸ کا حوالہ دیا ہے۔

آگے اسماعیل ریحان صاحب یہ بتاتے ہیں کہ یہی سنہ ۲۸ ہجری میں جانے والی اسلامی فوج قبرص کے ساحل پر اتری تو مقامی فوج نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور چار شرائط پر مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی (یہ بات بحوالہ "الکامل لابن الاثیر" ج ۲ ص ۴۶۹ لکھی ہے، اور یاد رہے کامل ابن اثیر میں بھی یہ بات "فتح قبرص" کے عنوان کے تحت ہی مذکور ہے، نہ کہ قسطنطینیہ کے غزوہ کے تحت) اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"یہ صلح چار سال تک قائم رہی، صلح کی مدت ختم ہوتے ہی ۳۲ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطینیہ کی طرف فوج کشی کر دی، وہ ایشیائے کوچک شمال کی طرف پیش قدمی کر کے بحیرہ اسود کے ساحل تک پہنچے، پھر وہ آبنائے قسطنطینیہ پر جا کر خیمہ زن ہوئے جہاں سے قیصر کے پایۂ تخت کی فصیل صاف دکھائی دیتی تھی"۔ ②

نوٹ: اس بات کے لیے اسماعیل ریحان صاحب نے "البدایة والنهایة" ج ۱۰ ص ۲۴۳ کا حوالہ دیا ہے۔

---

①② تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۶۱۰۔۶۱۱۔

حوالہ میں خیانت

قارئین محترم! اسماعیل ریحان صاحب نے یہاں ایک خاص مقصد کے تحت "البداية والنهاية" کے حوالے میں خیانت کی ہے، سنہ ۳۲ ہجری کے واقعات میں اس جگہ "البداية والنهاية" میں صرف اتنا لکھا ہے:

وَفِيهَا غَزَا مُعَاوِيَةُ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ الْمَضِيقَ - مَضِيقَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ - وَمَعَهُ زَوْجَتُهُ عَاتِكَةُ، وَيُقَالُ فَاطِمَةُ بِنْتُ قَرَظَةَ بْنِ عَبْدِ عَمْرِو بْنِ نَوْفَلِ بْنِ عَبْدِ مَنَافٍ. قَالَهُ أَبُو مَعْشَرٍ وَالْوَاقِدِيُّ..

ترجمہ: اس سال (یعنی ۳۲ ہجری۔ ناقل) میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی یہاں تک کہ آپ آبنائے قسطنطینیہ تک پہنچے، اور اس مہم میں آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ عاتکہ، اور کہا گیا ہے کہ فاطمہ بنت قرظہ بن تھیں.. یہ بات (یعنی سنہ ۳۲ ہجری میں اس مہم والی۔ ناقل) ابو معشر اور واقدی نے کہی ہے۔①

یہاں ہرگز ایسا کوئی ذکر نہیں کہ "اسلامی لشکر آبنائے قسطنطینیہ پر جا کر خیمہ زن ہوا جہاں سے قیصر کے پایۂ تخت کی فصیل صاف دکھائی دیتی تھی"، یہ الفاظ اسماعیل ریحان صاحب نے صرف یہ غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ مہم دراصل قسطنطینیہ پر حملہ تھا، اور وہ یہ

① البداية والنهاية، ج ۱۰ ص ۲۴۳ طبع هجر .

دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ قسطنطینیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ ۳۲ ہجری میں ہی ہو چکا تھا، چنانچہ اسماعیل ریحان صاحب اسی صفحے کے حاشیہ میں یوں مغالطہ دیتے ہیں:

"محققین کے نزدیک اُم حرام رضی اللہ عنہا سے منقول حدیث أول جیش من أمتی یغزون مدینة قیصر مغفور لهم سے یہی مہم مراد ہے (یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سنہ ۳۲ ہجری میں قبرص کو فتح کرنے کی مہم۔ ناقل) کیونکہ قسطنطینیہ کی پہلی مہم یہی تھی"۔ ①

نوٹ: آپ نے دیکھا کہ یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے بڑے جزم کے ساتھ لکھا ہے کہ: "محققین کے نزدیک سیدنا اُم حرام رضی اللہ عنہا سے منقول وہ حدیث جس میں قیصر کے شہر کا ذکر ہے اس سے قسطنطینیہ کی یہی پہلی مہم مراد ہے"، یعنی وہ قطعیت کے ساتھ "مدینۃ قیصر" سے مراد "قسطنطینیہ" بتا رہے ہیں، لیکن جب اسماعیل ریحان صاحب اپنی کتاب کی دوسری جلد میں پہنچتے ہیں تو شاید اپنے ان "محققین" کی بات بھول جاتے ہیں، چنانچہ وہاں اسی حدیث میں مذکور "قیصر کے شہر" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حدیث میں قسطنطینیہ نہیں بلکہ مدینۃ قیصر کا لفظ آیا ہے، یعنی قیصر کا پایۂ تخت، قیصر کا یورپی پایۂ تخت قسطنطینیہ تھا اور ایشیائی پایۂ تخت حمص، اس لیے یہ احتمال موجود ہے کہ اس بشارت کا مصداق وہ لشکر ہو جس نے حمص فتح کیا تھا، یہ مہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں انجام پی تھی"۔ ②

---

① ج ۱ ص ۶۱۱ حاشیہ۔

② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۵۶ حاشیہ۔

غور فرمائیں! پہلے "محققین" کے حوالے سے یقین کے ساتھ لکھا کہ "مدینۃ قیصر" سے مراد "قسطنطینیہ" ہی ہے اور حدیث میں مذکور بشارت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت سنہ ۳۲ ہجری میں جانے والی مہم کے شرکاء کے لیے ہے... اور دوسری جلد میں اس بات کو ہی مشکوک بتایا جا رہا ہے کہ "مدینۃ قیصر" سے مراد "قسطنطینیہ" ہے یا "حمص"؟. ظاہر ہے جب اپنے مفروضوں کو "تاریخ" کا نام دیا جائے گا پہلے کیا لکھا تھا وہ یاد کیسے رہے گا؟

یہاں ہم یہ بات بتاتے چلیں کہ "مدینۃ قیصر" سے مراد "حمص" لینے والی بات کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ درست نہیں سمجھتے، انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے:

"اس حدیث میں ذکر ہے کہ مدینۃ قیصر پر چڑھائی سے پہلے غزوہ بحر ہوگا اور اس میں سیدنا اُم حرام رضی اللہ عنہا بھی شریک ہوں گی، اور جب یہ پہلا غزوہ (یعنی سب سے پہلا سمندری غزوہ۔ ناقل) ہوا تو اس سے پہلے حمص فتح ہو چکا تھا (اور مدینۃ قیصر پر فوج کشی اس کے بعد ہونی تھی، لہٰذا "مدینۃ قیصر" سے مراد "حمص" لینا درست نہیں۔ ناقل)[1]۔

نیز اسماعیل ریحان صاحب نے اسی دوسری جلد میں ایک بار پھر اسی بات کو دہرایا ہے کہ قسطنطینیہ کی پہلی مہم سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت گئی تھی، اور وہاں بھی "البدایۃ والنہایۃ، ج ۱۰ ص ۲۴۳" کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے:

"اس لشکر نے (یعنی جو بقول اسماعیل ریحان صاحب سنہ ۳۲ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں قبرص کی طرف گیا تھا۔ ناقل) اس جگہ خیمے لگائے تھے جہاں اب استنبول کا مشرقی حصہ آباد ہے،

---

[1] ملخصاً: فتح الباری، ج ۶ ص ۱۰۳ المکتبۃ السلفیۃ.

اگرچہ اس مہم میں جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی مگر جہادی مہم کے لیے جانے پر بھی غزوہ کا اطلاق ہوتا ہے..."۔ ①

یاد رہے! البدایۃ والنہایۃ کے اس مقام پر ہرگز ایسی بات بیان نہیں ہوئی کہ سنہ ۳۲ ہجری میں جانے والے لشکر نے اس مقام پر خیمے لگائے تھے جہاں آج استنبول کا مشرقی حصہ آباد ہے، یہ الفاظ بھی اسماعیل ریحان صاحب نے اپنی طرف سے "البدایۃ والنہایۃ" کی طرف منسوب کیے ہیں۔

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۹۵۶ حاشیہ۔

کیا "مضیق قسطنطینیہ" تک پہنچنے کا مطلب "قسطنطینیہ شہر" پہنچنا ہے؟

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ خلیج فارس (جسے آج کل خلیج عربی بھی کہا جاتا ہے) اس کے اندر جانے کے لیے "مضیق ہرمز" سے گذرنا پڑتا ہے، اس خلیج فارس میں دبئی، ابوظہبی، قطر، بحرین، بصرہ اور کویت وغیرہ کی بندرگاہیں ہیں، ان سب بندرگاہوں پر بحری راستے سے جانے کے لیے لازمی ہے کہ خلیج فارس میں داخل ہوا جائے، اور اس کا ایک ہی راستہ ہے جو "مضیق ہرمز" کہلاتا ہے، اب کسی کتاب میں لکھا ہو کہ "فلاں لشکر کراچی سے چلا اور گوادر وغیرہ سے ہوتا ہوا "مضیق ہرمز" تک یا "خلیج فارس کے دروازے تک" جا پہنچا.. تو کیا اس سے یہ مراد لیا جاسکتا ہے کہ "وہ لشکر دبئی پہنچ گیا" یا وہ "کویت کی فصیل" تک جا پہنچا؟؟ ہرگز نہیں، لہٰذا صرف "مضیق قسطنطینیہ تک پہنچنے" کی عبارت سے اسماعیل ریحان صاحب کا یہ ثابت کرنا کہ یہ لشکر قسطنطینیہ شہر یا اس کی فصیل تک پہنچ گیا تھا اور وہاں اس نے خیمے لگا لیے تھے اور وہاں سے شہر کی فصیل نظر آرہی تھی یہ انہوں نے اپنے الفاظ اور اپنی "تخلیق شدہ" تاریخ کو "البدایة والنهایة" کے کھاتے میں ڈالا ہے، جبکہ وہاں یہ الفاظ سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہاں یہ بات بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے دو تین کتابوں کے حوالوں کو گڈمڈ کر کے بات کو گول مول کرنے کی کوشش کی ہے، قبرص کی فتح انہوں نے بغیر اختلاف بیان کیے سنہ ۳۳ ہجری لکھی ہے، جبکہ حافظ

ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سنہ ۳۳ ہجری میں فتح قبرص والا قول صرف ابو معشر کا ہے، جبکہ جمہور کا قول یہ نہیں (جمہور کے نزدیک قبرص سنہ ۲۸ ہجری میں فتح ہوا تھا۔ ناقل)①

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

" قیصر روم قسطنطین، افریقہ اور ایشیائے کوچک میں مسلمانوں کی مسلسل کامیابیوں سے سخت مضطرب تھا، اسلامی افواج کے خیمے اب وہ اپنے قلعے کے برجوں سے دیکھ سکتا تھا، اس نے مسلمانوں کا حملہ روکنے کے لیے اہل قبرص سے ساز باز شروع کردی، اہل قبرص نے عہد شکنی کرتے ہوئے رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف مدد دی اور انہیں جنگی کشتیاں فراہم کردیں، یہ خبر ملنے پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے پانچ سو کشتیوں کے ساتھ قبرص پر حملہ کردیا اور پورا جزیرہ بزور شمشیر فتح کرلیا..... یہاں تک کہ قبرص بحیرہ روم کا مضبوط اسلامی معسکر بن گیا، قبرص کی فتح سنہ ۳۳ ہجری کا واقعہ ہے"۔②

نوٹ: اس بات کے لیے انہوں نے "فتوح البلدان، ص ۱۵۴ کا حوالہ دیا ہے۔

ذہن میں رہے کہ "فتوح البلدان" میں بھی یہ بات "قبرص کی فتح" کے بیان میں ہی لکھی ہے، نہ کہ قسطنطینیہ پر چڑھائی کے بیان میں۔

---

① دیکھیں: البدایۃ والنہایۃ، ج ۱۰ ص ۲۵۸ .

② تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۶۱۱.

عمومی تبصرہ:

اسماعیل ریحان صاحب کے محولہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوا کہ وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے پہلا اسلامی بحری بیڑہ سن ۲۸ ہجری سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت سمندر میں اترا تھا۔

انہوں نے سنہ ۲۸ ہجری والے بحری بیڑے کا ذکر کرتے ہوئے صحیح بخاری کی کتاب الجہاد کی صرف اس حدیث کا حوالہ دیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے کچھ لوگوں کا سمندر میں سفر کرتے دیکھنا مذکور ہے، اور آگے چل پڑے ہیں، اور جان بوجھ کر اسماعیل ریحان صاحب نے اس حدیث کا ذکر نہیں کیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صریح ارشاد منقول ہے کہ: میری امت کا جو لشکر سب سے پہلے سمندر میں جہاد کرے گا اس کے لیے (جنت یا مغفرت) واجب ہے.. جبکہ یہ حدیث بھی صحیح بخاری کی اسی کتاب الجہاد میں ہے اور مشہور و معروف بھی ہے، یہ بات ناممکن ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب سے یہ حدیث یہاں سہواً رہ گئی ہو، بلکہ جان بوجھ کر نہیں ذکر کی گئی کیوں کہ اس سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے جنت یا مغفرت کی بشارت نکلتی تھی، جو وہ بیان کرنا نہیں چاہتے تھے۔

پھر اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب قسطنطینیہ پر پہلے حملے کی بات آتی ہے تو اسماعیل ریحان صاحب کو" بامر مجبوری" یہ حدیث خود اگلے صفحے کے حاشیے میں پیش کرنی بھی پڑتی ہے، کیونکہ وہاں انہوں نے یہ دھوکہ دینا ہے کہ قسطنطینیہ پر مسلمانوں کی پہلی چڑھائی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ہی ۳۲ ہجری میں ہوئی تھی.. اور اسماعیل ریحان صاحب اس بات کو" محققین" کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ①، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ:

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۶۱۱ حاشیہ۔

"سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، قسطنطینیہ کی خلیج تک یلغار کر چکے تھے، مگر یہاں تینوں اطراف سمندر سے گھرے اس شہر کی جغرافیائی قلعہ بندی نے یہ ثابت کر دیا کہ اس سمت سے اس پر حملہ تقریباً ناممکن ہے.." ①

ان کی اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت یہ لشکر (البدایۃ والنہایۃ کے مطابق) صرف "خلیج قسطنطینیہ" (جسے آبنائے قسطنطینیہ بھی کہا جاتا ہے) تک گیا تھا، یہ لشکر قسطنطینیہ نہیں پہنچ سکا تھا، اور چونکہ اس طرف سے شہر پر حملہ ناممکن تھا اس لیے وہیں سے واپس ہو گیا۔

لیکن دوسری جلد میں اسماعیل ریحان صاحب اس لشکر کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے جو ان کے بقول سنہ ۵۰ ہجری میں یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گیا تھا، لکھتے ہیں:

"آخر کار مسلمان آبنائے قسطنطینیہ عبور کر کے رومیوں کے اس ناقابل تسخیر پایۂ تخت پر حملہ آور ہوئے، یہاں شدید جھڑپیں ہوئیں.." ②

یعنی یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت (بقول اسماعیل ریحان صاحب) سنہ ۵۰ ہجری میں قسطنطینیہ پر حملہ کے لیے جانے والا لشکر "آبنائے قسطنطینیہ" سے واپس نہیں ہوا، بلکہ اسے عبور کر کے قسطنطینیہ پر حملہ آور ہوا تھا، تو پھر نہ جانے وہ کون سے محققین ہیں جو صرف "آبنائے قسطنطینیہ" سے ہی واپس ہونے والے لشکر کو اس شہر پر پہلا حملہ کرنے والا لشکر کہتے ہیں؟؟ کیونکہ حدیث میں "مدینۃ قیصر" (قیصر کے شہر) کے الفاظ ہیں، اور "مدینہ" آبنائے قسطنطینیہ کو عبور کرنے کے بعد ہی آتا تھا، نیز "قبرص" الگ مقام ہے اور "قسطنطینیہ"

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۶۱۳.
② حوالہ مذکورہ ص ۳۸۶.

الگ، دونوں ایک دوسرے سے تقریباً ۷۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں، اول الذکر قیصر کا پایۂ تخت نہ تھا، جبکہ "مدینۃ قیصر" یا قیصر کا پایۂ تخت "قسطنطینیہ" تھا. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قسطنطینیہ تک پہنچنے والے لشکر کا ذکر یوں کیا ہے:

"غَزَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ، مِنْهُمْ: ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَابْنُ الزُّبَيْرِ، وَأَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ.... یعنی یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی یہاں تک کہ وہ قسطنطینیہ پہنچ گئے، اور اس کے ساتھ سادات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بھی تھی، جن میں ابن عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) بھی تھے۔ ①

تو معلوم ہوا کہ جو سب سے پہلا لشکر قسطنطینیہ تک پہنچا تھا وہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت والا لشکر تھا. اور اگر کوئی لشکر اس سے پہلے اس طرف گیا بھی تھا تو وہ قسطنطینیہ تک نہیں پہنچا تھا بلکہ آبنائے سے ہی واپس ہو گیا تھا۔

ایک اور جگہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَحَجَّ ابْنُهُ يَزِيدُ سَنَةَ إِحْدَى وَخَمْسِينَ، وَفِيهَا أَوْ فِي الَّتِي بَعْدَهَا أَغْزَاهُ بِلَادَ الرُّومِ، فَسَارَ مَعَهُ خَلْقٌ كَثِيرٌ مِنْ كُبَرَاءِ الصَّحَابَةِ حَتَّى حَاصَرَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَقَدْ ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ: أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُو الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ مَغْفُورٌ لَهُمْ". وَقَدْ تَقَدَّمَ هَذَا كُلُّهُ. ②

(مفہوم: سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید نے سنہ ۵۱ ہجری میں حج

① البداية والنهاية، ج ۱۱ ص ۱۸۰ طبع هجر.
② حوالہ مذکورہ ص ۴۲۱.

کروایا (یعنی وہ امیر حج بنا) اور پھر اسی سال یا اس سے اگلے سال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے بلاد روم پر چڑھائی کے لیے بھیجا، اس مہم میں اس کے ساتھ بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، یہاں تک کہ یزید نے قسطنطینیہ کا محاصرہ کرلیا، اور صحیح (بخاری) میں ثابت شدہ حدیث ہے کہ: سب سے پہلا لشکر جو قسطنطینیہ پر چڑھائی کرے گا ان کی مغفرت کردی گئی ہے، یہ سب پہلے بیان ہو چکا)

اسماعیل ریحان صاحب کی غلط بیانی

آپ نے دیکھا کہ تقریباً تمام مؤرخین و شارحین حدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خاص قسطنطینیہ شہر پر سب سے پہلی فوج کشی سنہ ۵۰ ہجری کے بعد کی گئی اور اس پہلے لشکر کا امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ تھا، لیکن اسماعیل ریحان صاحب ایک نئی تاریخ تخلیق کرتے ہوئے ایک جگہ اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے دور کا ذکر کرتے ہوئے زیر عنوان "قسطنطینیہ کا جہاد" لکھتے ہیں:

"سلیمان بن عبد الملک چاہتا تھا کہ ولید کے دور کی فتوحات کی یادیں ایک بار پھر تازہ ہوں اور سندھ اور اندلس کی فتح سے بڑھ کر کوئی جہادی کارنامہ انجام دیا جائے، اس سوچ کے تحت اس نے بازنطینی رومی سلطنت کے پایۂ تخت قسطنطینیہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا، دنیا کے اس عظیم الشان تاریخی شہر پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں فوج کشی کی گئی تھی جو کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی، اس کے بعد کسی نے دوبارہ ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا"۔ ①

جبکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہرگز "قسطنطینیہ شہر" پر کسی قسم کی فوج کشی نہیں کی گئی تھی، یہ اسماعیل ریحان صاحب کی غلط فہمی ہے یا وہ جان بوجھ کر پڑھنے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، اگر "قبرص پر فوج کشی" یا سمندر

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۳ ص ۱۴۰.

میں "مضیق قسطنطینیہ" کے قریب پہنچنے کا نام "قسطنطینیہ شہر پر فوج کشی" ہے تو پھر "بلاد روم" پر ہر فوج کشی "قسطنطینیہ پر فوج کشی" کیوں نہیں کہی جاسکتی؟؟ اور ایسی فوج کشیاں دو نہیں بلکہ متعدد ہیں، دراصل اسماعیل ریحان صاحب نے سرتوڑ کوشش کی ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کردیا جائے کہ قسطنطینیہ کے شہر پر سب سے پہلی فوج کشی وہ نہ ثابت ہو سکے جو یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ہوئی تھی، اور اس کے لئے انہوں نے البدایۃ والنہایۃ کی عبارت کے اردو ترجمہ میں اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ بھی کردیا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے دعوی کیا ہے کہ "محققین کے نزدیک حدیث میں جو قیصر کے شہر پر پہلی چڑھائی کرنے والے لشکر کی بخشش کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ پہلی چڑھائی ہے جو سنہ ۳۲ ہجری میں ہوئی تھی" ① اور جیسا کہ بیان ہوا اس چڑھائی کا ذکر اسماعیل ریحان صاحب نے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی کتاب "البدایۃ والنہایۃ، ج ۱۰ ص ۲۴۳" کے حوالے سے کیا ہے، جبکہ انہی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ قسطنطینیہ پر سب سے پہلے لشکر کا امیر یزید معاویہ رضی اللہ عنہ تھا، یہی بات حافظ ابن حجر عسقلانی اور شیخ ابن تیمیہ (رحمہما اللہ) نے بھی لکھی ہے بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو اس پر سب کا اتفاق لکھا ہے۔ ②

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی سنہ ۵۰ ہجری کے واقعات میں غزوہ قسطنطینیہ

---

① ج ۱ ص ۶۱۱ حاشیہ۔

② حوالہ کے لیے دیکھیں: فتح الباری، ج ۶ ص ۱۰۳ المکتبۃ السلفیہ / البدایۃ والنہایہ، ج ۹ ص ۲۱۷ طبع ھجر / مجموع فتاوی ابن تیمیہ، ج ۳ ص ۴۲۳ و ج ۴ ص ۴۷۵ طبع سعودیہ۔

کا ذکر یوں کیا ہے:

"وَفِيهَا غَزْوَةُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ، كَانَ أَمِيرُ الْجَيْشِ إِلَيْهَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، وَكَانَ مَعَهُ وُجُوهُ النَّاسِ، وَمِمَّنْ كَانَ مَعَهُ أَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ رضی اللہ عنہ". ①

اور اس میں غزوہ قسطنطینیہ ہوا، اور امیر لشکر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ تھے، اور ان کے ساتھ معروف لوگ تھے، انہی میں سے ایک سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس سے پہلے (سنہ ۳۲ ہجری وغیرہ) میں قسطنطینیہ پر کسی حملے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

تو کیا اسماعیل ریحان صاحب ان سب علماء سے بڑے محقق ہیں؟؟

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا حسن وسیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے درمیان بشارت نبوی کے مطابق ہونے والی صلح کے بارے میں یہ دعوی کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلح کے بارے میں یہ وضاحت فرما دی تھی کہ یہ صلح "کدورت اور ناگواری کے ساتھ ہوگی" (اس پر مفصل کلام ہم پہلے کر چکے)، اور اس بات کے لیے انہوں نے حاشیہ میں شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہی ایک حوالہ دیا ہے کہ یہ ان کی تحقیق اور رائے ہے، جبکہ اس بات کی کوئی دلیل کہ یہ وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی ہے، شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی نہیں پیش کی تھی، لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے ان کی رائے کو لیتے ہوئے بلا تحقیق مزید یہ بات اپنی کتاب میں لکھی دی تھی اور اسماعیل ریحان صاحب کے وکلائے صفائی بھی اس

① تاریخ الاسلام للذهبي، ج ۴ ص ۲۱، دار الكتاب العربي بيروت .

بات پر بضد ہیں کہ اسماعیل ریحان صاحب نے تو حافظ ابن تیمیہ کی رائے کی بنیاد پر یہ دعوی کیا ہے، لہٰذا ان کا کوئی قصور نہیں، لیکن یہاں ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسماعیل ریحان صاحب نہ صرف شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق کو قبول کرنے پر تیار نہیں، بلکہ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر (رحمہما اللہ) کی تحقیق کو بھی قبول نہیں کرتے۔

اسی طرح بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ سیدنا اُم حرام رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکورہ بشارت یزید اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے ظہور میں آئی، لکھتے ہیں:

> "دوسرے خواب کا مصداق یہی یزید اور اس کے ساتھی ظہور میں آئے چنانچہ تاریخ جاننے والوں اور حدیث پڑھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہے...." ①

استاذ مکرم مولانا شیخ الحدیث محمد سرفراز خان صاحب صفدر نور اللہ مرقدہ نے بھی ایک استفسار کے جواب میں کہ "یزید کا اوّل جیش میں شامل ہونا جناب کے ہاں محقق ہے؟"، لکھا:

> "یزید اس لشکر میں شریک تھا بلکہ قائد تھا، جب کہ بخاری کی روایت میں تصریح موجود ہے"۔ (۲۶ ذو القعدہ ۱۴۱۷ ہجری/ ۲۵ مارچ ۱۹۹۷ء)

نوٹ: شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی تحریر مع دست خط کا عکس ہمارے پاس محفوظ ہے، اور یہ بات متعدد مجلّات میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

---

① قاسم العلوم مع أردو ترجمہ انوار العلوم، ص ۱۷۴، ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور.

محقق اہل سنت حضرت مولانا محمد نافع صاحب رحمہ اللہ نے بھی قسطنطینیہ پر پہلے حملے کرنے والے لشکر کا امیر ''یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ'' کو ہی بتایا ہے، لکھتے ہیں:

''غزوہ قسطنطینیہ ایک مشہور غزوہ ہے اور یہ سنہ ۵۱ ہجری میں پیش آیا تھا اور بقول بعض ۴۹ ہجری میں اس کا وقوع ہوا تھا، اور اس میں بڑے بڑے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی ہے.....''

آگے لکھتے ہیں:

''.....اس غزوہ کا امیر جیش یزید بن معاویہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس غزوہ میں بڑی کامیابی عطا فرمائی اور اہل اسلام کو رومیوں کے مقابلے میں عظیم فتح نصیب فرمائی، اور مسلمان غالب آ گئے، اور غزوہ ہٰذا میں شریک ہونے والوں کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (مغفور لہم) کی بشارت پہلے ہی دی جا چکی تھی، اس بناء پر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس غزوہ میں شرکت کو سعادت سمجھتے ہوئے شمولیت اختیار کی.....''

آگے ''مختصر تاریخ ابن عساکر'' اور ''البدایہ والنہایہ'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ

''.....۵۱ ہجری میں جب غزوہ قسطنطینیہ پیش آیا تو اس اسلامی لشکر کا امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ تھا، اور اس غزوہ میں (بمع دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی شریک وشامل ہوئے تھے''۔ ①

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے بھی قسطنطینیہ پر لشکر کشی کرنے

ملخصاً: فوائد نافعہ، ج ۲ ص ۲۱۰، ۲۱۱

والا لشکر وہی بتایا ہے جو یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گیا تھا، چنانچہ اپنے بیس ملکوں کے سفر نامہ" جہانِ دیدہ" میں لکھتے ہیں:

قسطنطینیہ پر حملے:

" جب سے رومی بادشاہ قسطنطین نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، اُس وقت سے اس کا نام "قسطنطینیہ" ہو گیا تھا، اور یہ بیک وقت بازنطینی سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا، اور اس کی ہی اہمیت تھی جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر پر جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی تھی"۔

(اس کے بعد مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے سیدنا اُم حرام رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث نقل فرمایا ہے اور پھر لکھا ہے):

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں بشارتیں اس طرح پُوری ہوئیں کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبرص پر حملہ کیا، یہ تاریخِ اسلام میں پہلی بحری مہم تھی، اور اس میں سیدنا اُمّ حرام رضی اللہ عنہا اپنے شوہر سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوئیں۔ یہ جنگی مہم اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اہل قبرص نے مسلمانوں سے صلح کر لی، اور جب واپس ہونے لگے تو سیدنا اُمّ حرام رضی اللہ عنہا ایک گھوڑے پر سوار ہونا چاہتی تھیں کہ اچانک گھوڑا بِدک گیا، اور اس نے آپ کو زمین پر گرا دیا، آپ اس زخم سے جان بر نہیں ہو سکیں، اور وہیں پر جامِ شہادت نوش کیا، اس کے بعد جب سیدنا

معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطینیہ پر پہلا حملہ کیا۔ اس حملے میں بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے جن میں سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی داخل ہیں۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطینیہ کا پہلا محاصرہ تھا جو کافی مدت جاری رہا اور سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی محاصرے کے دوران بیمار ہو کر وفات پا گئے اور قسطنطینیہ کی دیوار کے نیچے مدفون ہوئے جس کا واقعہ ان شاء اللہ آگے ذکر کروں گا"۔ ①

پھر آگے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں جو پہلا لشکر قسطنطینیہ پر حملے کے لئے روانہ کیا اس میں آپ بھی شامل تھے جس کا تذکرہ شروع میں کر چکا ہوں۔ محاصرہ طویل ہوا تو آپ بیمار ہو گئے، یزید آپ کی بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے، اور آپ سے پوچھا کہ کوئی خدمت بتایئے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: بس میری ایک خواہش ہے، اور وہ یہ کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کو گھوڑے پر رکھ کر دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک لے جانا ممکن ہو، لے جانا، اور وہاں لے جا کر دفن کرنا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہو گئی تو یزید نے آپ کی وصیت پر عمل کیا، اور قسطنطینیہ

① جہان دیدہ، ص ۳۱۹۔ ۳۲۰، طبع ادارۃ المعارف کراچی۔

کی دیوار کے قریب آپ کو دفن کیا گیا"۔ ①

تو کیا اسماعیل ریحان صاحب، مولانا نانوتوی رحمہ اللہ، شیخ الحدیث محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کو بھی "محققین" میں شمار نہیں کرتے؟

غور طلب یہ بھی ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے البدایۃ والنہایۃ کے حوالے کی عربی عبارت پیش نہیں کی بلکہ صرف اردو ترجمہ کیا ہے اور کارستانی یہ دکھائی ہے کہ "غزوہ قبرص" کو "غزوہ قسطنطینیہ" بنا کر پڑھنے والے کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس سنہ ۳۲ ہجری والے غزوے کا ذکر "فتح قبرص" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔

نیز جیسا کہ بیان ہوا، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی جس کتاب "البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے اسماعیل ریحان صاحب دے رہے ہیں، انہی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیدنا اُم حرام رضی اللہ عنہا والی حدیث کی تشریح میں صریح طور پر لکھا ہے کہ:

> "سمندر میں پہلا غزوہ سنہ ۲۷ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت ہوا تھا جب آپ نے قبرص پر چڑھائی کی تھی ... اور (اس حدیث میں مذکور۔ ناقل) دوسرا غزوہ، جو کہ قسطنطینیہ کا غزوہ ہے، تو سب سے پہلا وہ لشکر جس نے اس پر (قسطنطینیہ پر۔ ناقل) چڑھائی کی اس لشکر کا امیر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ تھا اور یہ سنہ ۵۲ ہجری کی بات ہے، اسی لشکر کے ساتھ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے..." ②

اور ہاں یہ بات یاد رہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے یہ اقرار کیا ہے کہ

---

① حوالہ مذکورہ، ص ۳۵۵۔۳۵۶.

② البدایۃ والنہایۃ، ج ۹ ص ۲۱۷ طبع ھجر.

قسطنطینیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کے لیے مغفرت اور جنت کی بشارت دی گئی تھی، لکھتے ہیں:

"سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کئی برسوں سے قیصر کے پایۂ تخت قسطنطینیہ پر کارگر حملے کی ممکنہ تدابیر پر غور کر رہے تھے، چونکہ اس محاذ پر جہاد کرنے والے لشکر کے لیے حدیث میں مغفرت اور جنت کی بشارت دی گئی تھی اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی فتح کو بہت اہم سمجھتے تھے"۔ ①

فی الحال ہمارا موضوع وہ دور از کار تاویلات نہیں جن کی بنیاد پر یزید کو اس بشارت سے ہر حال میں خارج کرنے کے لیے اسماعیل ریحان صاحب اور ان کے ہمنوا کئی ورق سیاہ کرتے ہیں اور زبان نبوت سے نکلی ہوئی اس مغفرت کی بشارت کو معاذ اللہ ایک عام نجومی کی بات کی طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر گنہگار مسلمان کی مغفرت کر سکتے ہیں لیکن یزید کی مغفرت اللہ کے اختیار میں نہیں اور اس کی مغفرت ناممکن ہے (خلاصہ ان تمام تاویلات کا یہی نکلتا ہے) بلکہ ابھی یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کس طرح اسماعیل ریحان صاحب نے یہ نئی تاریخ "تخلیق" کی ہے اور کیسے وہ تاریخ کی قدیم کتب کا حوالہ کے طور پر نام تو لکھتے ہے لیکن اپنی طرف سے حوالے میں الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں.....

نیز یہ بات ثابت کرنا بھی مقصود ہے کہ حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ حدیث کی رُو سے خود اسماعیل ریحان صاحب کی "نرالی تحقیق" کے مطابق بھی جنتی ہونے اور مغفرت ہونے کی دونوں بشارتیں جن دو لشکروں کے لیے بیان کی گئی

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۶۱۳.

ہیں ان دونوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ شریک تھے... دوسرے لفظوں میں یہ حدیث سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ ان دونوں لشکروں میں شامل ہونے والوں کے لیے جنت اور مغفرت کی بشارت ہے.. لیکن یہ بات صراحت کے ساتھ لکھتے ہوئے شاید اسماعیل ریحان صاحب کو کوئی انقباض ہوتا ہے۔

خلفاء راشدین چار؟ یا پانچ؟
اسماعیل ریحان صاحب کی" مستند تاریخ" کی روشنی میں

جناب اسماعیل ریحان صاحب" خلافت راشدہ کے متعلق اسلامی عقیدہ" کا عنوان باندھ کر لکھتے ہیں:

" جمہور مسلمین کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے کہ خلافت راشدہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک تھی، جب کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حکومت کے پانچ مہینے دور علوی ہی کا تتمہ تھے، ان کے بعد کا دور، خلافت راشدہ میں شامل نہیں"۔ ①

نیز غور فرمائیں! آگے صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

" یہ کوئی تاریخی بحث نہیں، عقیدے کا مسئلہ ہے، اسی لئے اس بحث کو کتب عقائد میں درج کیا گیا ہے"۔ ②

ملاحظہ فرمائیں! یہاں پہلے تو" جمہور مسلمین" لکھ کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ کچھ مسلمین ایسے بھی ہیں جن کا یہ عقیدہ نہیں ہے، اور پھر آگے" متفقہ اور اجماعی" لکھ کر یہیں تضاد پیدا کر دیا گیا، کیونکہ امت کا" متفقہ اور اجماعی عقیدہ" تو وہی ہوگا جو جمہور نہیں بلکہ تمام کے تمام مسلمین کا عقیدہ ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عرصہ" پانچ مہینے" لکھا ہے، جبکہ وہ خود صریح طور پر یہ لکھ چکے ہیں کہ سیدنا

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۵۰.

حسن رضی اللہ عنہ، رمضان سنہ ۴۰ ہجری (مطابق اواخر جنوری ۶۶۱ء) میں خلیفہ بنے اور ربیع الآخر سنہ ۴۱ ہجری (مطابق اگست ۶۶۱ء) میں خلافت سے دست بردار ہوئے۔ ① ،لہٰذا یہ عرصہ کسی بھی طرح چھ ماہ سے کم نہیں بنتا۔

بلکہ وہ خود پہلے صریح الفاظ میں لکھ چکے ہیں کہ:

" سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کے چھ ماہ تتمے کے طور پر خلافت علویہ کا حصہ سمجھے جاتے ہیں"۔ ②

اس کی مزید تفصیل اسماعیل ریحان صاحب کی کتاب سے ہی پیش خدمت ہے:

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۵۶.

② حوالہ مذکورہ، ج ۱ ص ۴۵۶ زیر عنوان" خلافت راشدہ سے کیا مراد ہے؟".

تیس سالہ خلافت کہاں سے کہاں تک؟

وفات نبی کریم ﷺ :۔ ۱۲ ربیع الاول، ۱۱ ہجری بمطابق ۸ جون ۶۳۲ء۔ ①

خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

از: ۱۲ ربیع الاول، ۱۱ ہجری بمطابق ۸ جون ۶۳۲ء

تا: ۲۲ جمادی الآخرۃ، ۱۳ ہجری بمطابق ۲۴ اگست ۶۳۴ء ②

کل مدت: ۲ سال ۳ ماہ ۱۰ دن تقریباً

خلافت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ:

از: ۲۳ جمادی الآخرہ، ۱۳ ہجری بمطابق ۲۵ اگست ۶۳۴ء

تا یکم محرم، ۲۴ ہجری بمطابق ۷ نومبر ۶۴۴ء ③

کل مدت: ۱۰ سال ۵ ماہ ۷ دن تقریباً

خلافت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ:

از: یکم محرم، ۲۴ ہجری بمطابق ۷ نومبر ۶۴۴ء

تا: ۱۸ ذوالحجہ، ۳۵ ہجری بمطابق ۱۷ جون ۶۵۶ء ④

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۱ ص ۴۴۱.

② حوالہ مذکورہ ص ۶۳۸.

③ حوالہ مذکورہ ص ۵۰۱، ۶۴۱.

④ حوالہ مذکورہ، ج ۱ ص ۵۹۰ اور ج ۲ ص ۴۵۵.

کل مدت: ۱۱ سال ۱۱ ماہ ۲۴ دن تقریباً

خلافت علی المرتضی رضی اللہ عنہ:

از: ۲۴ ذوالحجہ، ۳۵ ہجری بمطابق ۲۳ جون ۶۵۶ء

تا: ۱۷ رمضان، ۴۰ ہجری مطابق ۲۵ جنوری ۶۶۱ء①

کل مدت: ۴ سال ۸ ماہ ۲۳ دن تقریباً

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب کی تحقیق کے مطابق، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے درمیان ۶ دن کا فاصلہ ہے۔

خلافت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ:

از: ۱۷ رمضان، ۴۰ ہجری بمطابق اواخر جنوری ۶۶۱ء

تا دست برداری: ربیع الآخر، ۴۱ ہجری بمطابق اگست ۶۶۱ء②

کل مدت: ۶ ماہ اور کچھ دن اوپر

اس حساب سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ابتداء خلافت سے لے کر، سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کل مدت: تقریباً ۲۹ سال ۵ ماہ ۱۰ دن بنتی ہے۔

یوں "تیس سالہ خلافت" پوری کرنے کے لیے مزید ۶ ماہ اور ۲۰ دن مزید شامل کرنے ہوں گے اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی تقریباً اتنی ہی ہے۔

تیسری بات یہ کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت الگ ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت الگ ہے، دونوں کی شخصیات بھی علیحدہ ہیں، پھر یہ تکلف کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے دور کو "خلافت راشدہ کا تتمہ" بتا کر خلافت

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ صفحات ۱۵۸، ۴۵۵، ۴۵۶.

② حوالہ مذکورہ ص ۴۵۶.

راشدہ میں شامل بھی کیا جائے اور دوسری طرف خلفاء راشدین کی تعداد صرف چار بھی بتائی جائے؟ اگر تو سیدنا سفینہ رضی اللہ عنہ کی "تیس سالہ خلافت" والی حدیث صحیح ہے اور اس بارے میں نص ہے کہ خلافت راشدہ تیس سال تک ہی ہوگی، تو پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا دور بھی یقیناً ان تیس سال کے اندر آتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ انہیں خلفائے راشدین میں شمار نہ کیا جائے، اور پھر اس حدیث میں خلافت راشدہ کو صرف چار میں منحصر کرنے کی بات ہی نہیں، اور اگر (بقول اسماعیل ریحان صاحب) مسلمانوں کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوگئی تو پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو کھینچ تان کر اور "تتمہ" کا نام دے کر خلفاء راشدین میں داخل کرنے کا تکلف کیوں؟ یہ منطق آج تک ہماری سمجھ میں تو نہیں آسکی۔

یاد رہے! خود اسماعیل ریحان صاحب نے متعدد مقامات پر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو صریح الفاظ میں اصطلاحی معنوں میں "خلیفہ راشد" لکھا ہے، مثلاً سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے مختصر دور خلافت کے بارے میں ایک جگہ یہ لکھ آئے ہیں کہ:

> "حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی منصب خلافت سے از خود سبک دوشی کے ساتھ ہی امت کی تاریخ کا وہ مبارک ترین دور اختتام پذیر ہو گیا جسے خلافت نبوت یا خلافت راشدہ کہا جاتا ہے، اس کے بعد جو دور شروع ہوا، جمہور علمائے اسلام اسے خلافت عامہ کہتے ہیں..." ①

اور پھر وہ خود خلافت راشدہ کے بعد "خلافت عامہ" کا دور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے ہی شروع کرتے ہیں۔ ② جس کا واضح مطلب ہے کہ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۴۲۔ ② حوالہ مذکورہ ص ۳۵۳۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت (اصطلاحی) خلافت راشدہ اور خلافت نبوت تھی۔

نیز ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ، دنیوی بادشاہ نہیں، ان خلفائے راشدین کا تتمہ اور عکس تھے جن کا اقتدار ذات، غرض، نفس، خواہش اور مفاد جیسے مفاہیم سے نا آشنا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جس بے مثال ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا وہ ایک خلیفہ راشد ہی کے بس کی بات تھی.." ①

اب سوال یہ ہے کہ کون سا عقیدہ درست ہے؟ جمہور مسلمانوں کا وہ والا متفقہ اور اجماعی عقیدہ کہ خلافت راشدہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک تھی؟ یا یہ عقیدہ کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی سبک دوشی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متفقہ خلیفہ بننے تک خلافت راشدہ ہی تھی؟؟ پہلی صورت میں خلفاء راشدین کی تعداد چار بنتی ہے، اور دوسری صورت میں پانچ۔

نیز ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ایک خلیفہ راشد اپنی خلافت اپنی مرضی سے کسی دوسرے کے سپرد کرے تو کیا یہ خلافت منتقل ہوتے ہی "خلافت راشدہ" سے "خلافت عامہ" یا "ملوکیت" بن جائے گی؟، بتایا جائے کہ یہ خلافت کی "نوعیت" کی تبدیلی شخصیتوں کی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی یا کسی اور وجہ سے؟

ضروری نوٹ:

دو باتوں میں فرق ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہئے، ایک بات یہ ہے کہ:

"سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ تک چاروں خلفاء بالترتیب، خلفاء راشدین تھے، اور ان چاروں کی خلافت، خلافت

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۴۹.

راشدہ تھی"۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ:

" صرف یہ چار ہی خلفاء راشدین ہیں، انکے علاوہ کوئی پانچواں خلیفہ راشد نہیں ہے، اور نہ ہی کسی اور کو خلیفہ راشد کہا جا سکتا ہے"۔

ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، علماء امت نے روافض کے جواب میں اہل سنت کے عقیدے کے طور پر پہلی بات لکھی ہے (خود اسماعیل ریحان صاحب نے اس جگہ حاشیہ میں تقریباً ۱۲ حوالے نقل کیے ہیں، تقریباً ان سب میں یہی بات بیان ہوئی ہے کہ ان چاروں کو خلیفہ راشد تسلیم کرنا ضروری ہے، یہ خلفاء راشدین ہیں، اور جو ان چاروں میں سے کسی ایک کی خلافت پر بھی طعن کرے وہ گمراہ ہے..وغیرہ)①

لیکن کیا یہ بات بھی عقیدہ اہل سنت میں شامل ہے کہ" ان چار کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ راشد نہیں کہا جا سکتا؟" تو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، اور اگر کسی کا اصرار ہے کہ یہ بات بھی عقیدہ اہل سنت میں شامل ہے، تو پھر اسماعیل ریحان صاحب نے خود اہل سنت کے اس عقیدے کی خلاف ورزی کی ہے جب انہوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بھی" اصطلاحی" خلافت راشدہ اور خلافت نبوت میں داخل کیا ہے، کیونکہ یوں" خلفاء راشدین" کی تعداد" پانچ" بنتی ہے. اور یہ تاویل کسی کام کی نہیں کہ" سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت چونکہ چوتھے خلیفہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ہی تتمہ تھی اور وہ خلافت راشدہ کا عکس تھی، اس لیے اسے الگ سے شمار نہ کیا جائے"، اس کے جواب میں اگر کوئی یہ تاویل کر دے کہ چونکہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۵۰۔۳۵۱.

نے اپنی" خلافت راشدہ" ہی برضاء ورغبت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو منتقل کردی تھی تو یوں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت دراصل سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کا ہی امتداد تھی تو اس کی یہ بات کیوں کر قبول نہ کی جائے گی؟

باغیوں کے خلاف ریاستی طاقت کے استعمال کے بارے میں قرآن مجید کی ہدایت، اور جناب اسماعیل ریحان صاحب کے تضادات

جناب اسماعیل ریحان صاحب، جنگ صفین پر بات کرتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو باغی اور خروج کرنے والا ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ، قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ان کے خلاف ریاستی طاقت استعمال کر کے خروج کی شرعی سزا بھی پورے شرح صدر کے ساتھ جاری کر چکے..." ①

اسماعیل ریحان صاحب کی اس بات سے معلوم ہوا کہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کے خلاف جو لشکر کشی فرمائی وہ قرآنی حکم کے مطابق ریاست کے خلاف خروج کرنے والوں کی شرعی سزا کے نفاذ کے لئے تھی، اب یہ قرآنی حکم کہاں بیان ہوا ہے؟ یقیناً اسماعیل ریحان صاحب کا اشارہ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۹ کی طرف ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرواؤ، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، چنانچہ اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۷۷.

انصاف کے ساتھ صلح کرادو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"۔ ①

اس آیت کریمہ میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں:

۱۔ دونوں گروہوں میں سے جس گروہ کی زیادتی ہو (یہاں بغي کا معنی مفتی تقی صاحب نے وہ بغاوت نہیں کیا جس کا ڈھنڈورا اسماعیل ریحان صاحب اپنی کتاب میں بار بار پیٹ رہے ہیں) تو اس زیادتی کرنے والے گروہ کے خلاف قتال یعنی لڑائی کا حکم ہے "فقاتلوا" کے ساتھ۔

۲۔ اور اس زیادتی کرنے والے گروہ کے ساتھ اس وقت تک لڑائی کا حکم ہے جب تک وہ گروہ اپنی زیادتی سے باز آ کر اللہ کے حکم کی طرف نہ لوٹ آئے۔

۳۔ اگر وہ زیادتی کرنے والا گروہ، اپنی زیادتی چھوڑ کر اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو اس صورت میں دونوں گروہوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کروانے کا حکم ہے۔

لیکن دوسری طرف اسماعیل ریحان صاحب "شام پر فوج کشی کا مقصد" ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ:

"سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مقصد جنگ نہیں تھا بلکہ مملکت کو یکجا کرنا اور امت کو متحد کرنا تھا، بڑی فوج جمع کرنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ اہل شام کو ملیامیٹ کر دیا جائے بلکہ اس میں یہ حکمت ملحوظ تھی کہ حریف پر جنگ سے پہلے ہی دباؤ پڑ جائے اور جنگ کے بغیر یا معمولی لڑائی سے معاملہ حل ہو جائے..." ②

---

① ترجمہ از: آسان ترجمہ قرآن، مفتی تقی عثمانی صاحب۔

② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۲۱۔

لیجئے! یہاں بتا رہے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مقصد جنگ یعنی "قتال" نہیں تھا بلکہ امت کو یکجا اور متحد کرنا تھا، جب کہ اسی جلد ۲ کے صفحہ ۷۷۷ پر یہ بتاتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پورے شرح صدر کے ساتھ قرآن مجید کی ہدایت "فقاتلوا التي تبغي" کے مطابق ان کے خلاف جنگ کی اور مقصد ان پر خروج کی شرعی سزا جاری کرنا تھا..."

اب آئیں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ جنگ صفین میں ہوا کیا تھا؟

اسماعیل ریحان صاحب کے بقول، اسی مندرجہ بالا آیت کریمہ پر عمل کرتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نواؤں (جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ابھی نہیں کی تھی) کے خلاف ریاستی طاقت استعمال فرمائی، اور اس آیت میں خروج کرنے والوں کی جو شرعی سزا بیان ہوئی ہے وہ نافذ کی، یعنی ان کے خلاف قتال کیا.. یہ بات ذہن میں رکھیں۔

لیکن جناب اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ جنگ صفین میں جو جنگ بندی ہوئی اور صلح صفائی پر جو اتفاق ہوا (یعنی تحکیم پر رضامندی)، وہ بھی اسی آیت کے حکم کے مطابق تھی، لکھتے ہیں:

"حالانکہ حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ثالثی نامے پر اتفاق اس آیت مبارکہ کی تعمیل میں تھا: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا.. اگر اہل ایمان کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کر دیا کرو، اسی میں مسلمانوں کی مصلحت اور بھلائی تھی، قرآن مجید تو حربی کفار کی طرف سے بھی صلح کی پیش کش قبول کرنے کی ہدایت کرتا ہے..... مگر افسوس

کہ شر پسندوں کو یہ بھی گوارا نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے کلمہ گو مسلمان بھائیوں سے صلح کر لیں"۔ ①

نوٹ: یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے صرف آیت کا ابتدائی حصہ ہی نقل کیا ہے، اگلا حصہ جس میں اس زیادتی کرنے والے گروہ کے اللہ کے حکم کی طرف لوٹنے تک قتال کا حکم ہے وہ جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا۔

بہر حال یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے یہ بتایا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جو کہ قرآنی حکم کے مطابق باغیوں کے خلاف ریاستی طاقت کا استعمال فرما رہے تھے، انہوں نے عین جنگ کے دوران صلح پر رضامندی ظاہر فرمائی اور بقول اسماعیل ریحان صاحب یہ بھی اسی آیت کریمہ کے مطابق تھا۔

اور یہی اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

"اسلامی تاریخ میں پہلا بڑا خروج یہی تھا جو جنگ صفین سے ۴۰ ہجری تک جاری رہا، ۴۰ ہجری کے دوران سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہوا، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ان کی شہادت تک نہیں کی گئی"۔ ②

یعنی بقول اسماعیل ریحان صاحب، جن باغیوں اور خروج کرنے والوں کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے قرآنی حکم کے مطابق خروج کی شرعی سزا نافذ کرنا شروع کی تھی، ان کی بغاوت اور خروج جنگ صفین میں ختم نہیں ہوا تھا، اور نہ ہی جنگ بندی کے وقت ختم ہوا تھا، بلکہ ان کا خروج سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت (سنہ ۴۰ ہجری) تک جاری تھا، لیکن اس کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے صفین کی جنگ بندی کے بعد کوئی کاروائی نہیں فرمائی، بلکہ الٹا (بقول اسماعیل ریحان صاحب)

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۴۹.
② حوالہ مذکورہ ص ۷۷۶.

ان باغیوں اور خروج کرنے والوں کے ساتھ سرحدوں کے احترام کا معاہدہ فرمایا۔

اب کیا اسماعیل ریحان صاحب، مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں:

۱۔قرآنی حکم تو صریح طور باغیوں کے خلاف اس وقت تک قتال کرتے رہنے کا ہے جب تک وہ اپنی بغاوت سے باز آکر اللہ کے حکم کی طرف نہ لوٹ آئیں.. فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ..تو کیا جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے صفین میں (بقول اسماعیل ریحان صاحب) باغیوں کے خلاف جنگ یعنی قتال روک دیا اور صلح پر رضا مندی فرمائی، تو وہ باغی اپنی بغاوت سے باز آچکے تھے؟؟ اگر نہیں بلکہ اسماعیل ریحان صاحب کے بقول وہ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک خروج کرنے والے اور باغی ہی رہے تھے، تو پھر ان کے خلاف جنگ یعنی قتال، اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آنے تک جاری رکھنا قرآن کا حکم تھا یا جنگ روک کر الٹا ان کے ساتھ ان کے زیر تسلط علاقوں کی سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کرنا قرآنی حکم تھا؟

۲۔آیت کریمہ میں تو حکم ہے کہ مومنین کی دو جماعتوں میں اگر لڑائی ہو جائے تو پہلے صلح کی کوشش کرو، بصورت دیگر جس جماعت کی زیادتی ہے اس کے خلاف قتال کرو.." فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ " ..اور قتال بھی تب تک کرو جب تک وہ زیادتی کرنے والی جماعت، اپنی زیادتی سے توبہ نہ کرلے.." حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ " ...تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس کثیر تعداد کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن میں سابقون اولون اور جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے جو

ان جنگوں میں غیر جانبدار رہے تھے؟؟ (ان غیر جانبدار رہنے والے فریق میں سے خود اسماعیل ریحان صاحب نے چند مشہور صحابہ کے نام بھی لکھے ہیں، جیسے سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا سعید بن زید، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا اسامہ بن زید، سیدنا صہیب رومی، سیدنا ابوموسی اشعری، سیدنا حسان بن ثابت، سیدنا جریر بن عبداللہ، سیدنا مسلمہ بن مخلد، سیدنا ابوسعید خدری، سیدنا محمد بن مسلمہ، سیدنا زید بن ثابت اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم)۔① تو کیا انہوں نے "فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ" کے حکم کے خلاف کیا؟ یا انہیں علم ہی نہیں تھا کہ دونوں میں سے "قطعی مصیب" کون ہے اور "قطعی مخطی" کون؟ یا وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ باغی اور زیادتی کرنے والا کون ہے؟؟ بلکہ آیت کریمہ کے ظاہری الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا" اور "فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ" والے حکم سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس غیر جانبدار جماعت کے لئے ہی تھے کیونکہ وہ دونوں فریقوں میں سے کسی کے ساتھ شریک نہ تھے۔

۳۔ اسماعیل ریحان صاحب نے بار بار یہ لکھا ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے قتل والی حدیث جس میں "الفئة الباغية" آیا ہے، یہ متواتر اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔②، تو سوال ہے کہ جب تک سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت نہیں ہوئی تھی، تب تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کا "الفئة الباغية" ہونا شبہ میں تھا، لیکن اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے (بقول اسماعیل ریحان

---

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۷۳ مع حاشیہ۔
② ج ۲ ص ۷۷۷۔

صاحب) قرآنی حکم کے مطابق ان پر شرعی سزا نافذ کرنے کے لیے قتال شروع کیا، لیکن جب سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی، اور اس گروہ کا باغی ہونا بقول اسماعیل ریحان صاحب" حدیث متواتر" کی رو سے یقینی وقطعی ہو گیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک دم قتال روک دیا اور جنگ بندی پر راضی ہو گئے، اور بعد میں ان" یقینی وقطعی باغی گروہ" کے ساتھ سرحدوں کے احترام کا معاہدہ بھی کرتے ہیں۔ ①، تو کیا واقعی سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یقینی وقطعی وشرعی وفقہی باغیوں کے ساتھ صلح فرمائی اور ان کے ساتھ بجائے قتال جاری رکھنے کے جنگ بندی فرمائی، اور ان کے زیر تسلط علاقوں پر ان کا تسلط قبول فرمالیا؟، بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ یہ فرمانے لگے کہ:

" معاویہ کی حکمرانی کو ناگوار مت سمجھو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر معاویہ تم سے رخصت ہو گئے تو تم لوگوں کو حنظل کے پھلوں کی طرح کندھوں سے کٹ کٹ کر گرتا دیکھوں گا"۔ ②

اور خود اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں کہ:

" ائمہ اربعہ کی فقہ کی کتب میں بغاۃ کے احکام کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اُسوہ مانا گیا ہے..." ③

تو کیا اب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے، باغیوں کے احکام یہ

---

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۶۸۔۲۶۹ زیر عنوان" سرحدوں کے احترام کا معاہدہ.
② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۶۷ وقال اسماعیل ریحان: بسند صحیح.
③ حوالہ مذکورہ ص ۷۸۹.

ہوئے کہ جب تک کسی کی بغاوت مشکوک ہو اس وقت تو اس کے ساتھ قرآنی حکم کے مطابق جنگ کی جائے، اور جب (بقول اسماعیل ریحان صاحب) متواتر روایت کی رو سے بغاوت قطعی ثابت ہو جائے تو جنگ بند کر دی جائے اور ان باغیوں کا تسلط ان کے زیر قبضہ علاقوں پر تسلیم کر لیا جائے اور سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کر لیا جائے جب کہ وہ باغی اپنی بغاوت سے توبہ بھی نہ کریں، اور پھر انہی باغیوں کو پوری خلافت بھی سونپ دی جائے؟؟؟ اگر باغیوں کے یہی احکام ہیں تو بتایا جائے۔

۴۔ اسماعیل ریحان صاحب نے زیر عنوان" اسلامی سیاست کے ایک اہم اصول کی بنیاد" ،لکھا ہے:

" حضرت علی رضی اللہ عنہ آخر تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مصالحانہ پالیسی پر قائم رہے، آپ رضی اللہ عنہ کا فقیہانہ فیصلہ بعد میں عالم اسلام کی دیگر خلافتوں کے لیے یہ گنجائش پیدا کر گیا کہ اگر کسی علاقے کا کوئی مسلم حاکم ارباب خلافت سے اختلاف رائے کی بنا پر الگ ہو کر خود مختار حکومت قائم کر لے تو خلیفہ پر یہ واجب نہیں کہ وہ اس سے بہر صورت جنگ کرے، اگر مسلمانوں کی مصلحت اس میں ہو کہ اس کی خود مختارانہ حیثیت کو ایک زمینی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا جائے اور عدم تعرض کی پالیسی اپنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں"۔ ①

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ کی متوازی حکومتوں پر اس اصول کا اطلاق

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۷۰.

کیوں نہیں کیا گیا؟

بہر حال غور فرمائیں! جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا صرف شام پر تسلط تھا تو اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق پورے شرح صدر کے ساتھ قرآنی حکم کی بنیاد پر جنگ ناگزیر تھی اور جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا نصف کے قریب ملک پر تسلط ہو گیا تو اسماعیل ریحان صاحب بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی مصلحت اس میں تھی کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خود مختارانہ حیثیت کو ایک زمینی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا جائے اور سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کر لیا گیا اور اس صورت میں خلیفہ پر یہ واجب نہیں کہ وہ بہر صورت جنگ کرے۔

اور خود یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

"بغاوت کا مرتکب سخت سزا کا مستحق ہے. بغاوت سنگین جرم ہے، حکمران کی موجودگی میں کسی دوسرے حکمران کی بیعت درست نہ ہوگی بلکہ بیعت کرنے اور لینے والا دونوں قابل سزا ہوں گے، ارشاد نبوی ہے: **اذا بُویع لخلیفتین فاقتلُوا الآخر منهما.** جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو"۔ ①

اب عجیب صورت حال ہو گئی، اسماعیل ریحان صاحب، ایک طرف ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بلکہ اس کے بعد بھی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح تک بدستور "خروج" اور "بغاوت" کے مرتکب ہی رہے تھے، انہوں نے یہ تک لکھا ہے کہ "حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ایک متوازی اور غیر آئینی حکومت تھی" ②، تو اس صورت میں تو "بغاوت کرنے والے"

① تاریخ امت مسلمہ، ج ا ص ۶۲۲.
② ج ۲ ص ۸۲۵.

سنگین جرم کے مرتکب ٹھہرے، اور سخت سزا کے مستحق تھے، اور ایک " آئینی خلیفہ" کے ہوتے ہوئے " متوازی حکومت" قائم کرنا بھی قابل سزا جرم تھا، اور ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے دوسرے خلیفہ کو قتل کرنے کا حکم خود اسماعیل ریحان صاحب حدیث نبوی سے بتا آئے ہیں، لیکن ہوا یہ کہ بجائے انہیں سزا دینے کے، ان کی خود مختارانہ حیثیت کو ایک زمینی حقیقت کے طور پر قبول کر کے ان کے ساتھ سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کر لیا گیا، اور پھر بعد میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے بقول اسماعیل ریحان صاحب ایک " غیر آئینی متوازی حکومت" چلانے والے کو اپنی خلافت ہی سونپ دی.. اس معمہ کو کون حل کرے گا؟

۵۔ لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ سیدنا علی وحسن رضی اللہ عنہما کے نزدیک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت وہ والی " حقیقی وشرعی وفقہی باغی" نہیں تھی، جن کے ساتھ ہر حال میں قتال کرنے کا حکم ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی بغاوت سے توبہ کر لیں اور اللہ کے حکم کی طرف آ جائیں؟؟ نیز آیت کریمہ

" فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى "

میں بھی مطلق زیادتی کا ذکر ہے، ابھی حال ہی میں خود اسماعیل ریحان صاحب نے اپنے ایک کالم میں یہ حوالہ نقل کیا ہے کہ:

" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ان حضرات کو (یعنی جن کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جنگ ہوئی۔ ناقل) بُرا بھلا کہہ رہا ہے تو اسے اس حرکت سے منع کیا اور فرمایا: ایسا مت کہو! وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان سے بغاوت کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہم سے بغاوت کی ہے، پس ہم نے باہم قتال کیا. بحوالہ:

منہاج السنۃ لابن تیمیہ ج ۵ ص ۲۴۵"۔ ①

نوٹ: جس عربی عبارت کا یہ اردو ترجمہ اسماعیل ریحان صاحب نے کیا ہے اس کے عربی الفاظ یہ ہیں: **إِنَّمَا هُمْ قَوْمٌ زَعَمُوا إِنَّا بَغَيْنَا عَلَيْهِمْ، وَزَعَمْنَا أَنَّهُمْ بَغَوا عَلَيْنَا فَقَاتَلْنَاهُمْ.**

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے فریق مخالف کے بارے میں جو یہ فرمایا کہ: "وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان سے بغاوت کی ہے" اس کا کیا مطلب ہوگا؟ کیا واقعی جمل وصفین کی جنگوں کے وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کشی کو وہ لوگ "بغاوت" سمجھتے تھے؟؟ اور کیا ان کی حکومت میں کسی علاقے پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے قبضہ کر لیا تھا؟؟ (کیونکہ اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک بغاوت کے لیے کسی علاقے پر قبضہ کرنا ضروری ہے)

لہٰذا اس سے بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ یہاں "بغاوت" کا معنی وہ معروف بغاوت نہیں جسے اسماعیل ریحان صاحب "شرعی وفقہی بغاوت" بتاتے ہیں، بلکہ یہاں لفظ بغاوت صرف ایک فریق کی دوسرے پر زیادتی کے معنی میں ہی ہے اور بس۔

علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے بے شک طائفہ باغیہ ہوں گے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے ماتحت نہیں آتے اس لیے کہ باغی اسے کہتے ہیں جو کسی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے خلاف ہو جائے اور جو شروع سے ہی مخالف ہو اس پر باغی کا لفظ پورا منطبق

① دیکھیں: روزنامہ "اسلام" مورخہ ۵ جون ۲۰۲۰، کالم بعنوان "گلہ بھی سن لے"۔

نہیں اترتا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور پھر وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے والے اس حدیث کی رو سے طائفہ باغیہ ہیں لیکن جب تک ان قاتلوں کی نشاندھی نہ ہو جائے ہم اس حدیث کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پورے لشکر پر منطبق نہیں کر سکے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو اپنی وفات کے وقت تک مسلمانوں کے بالاتفاق حکمران تھے مختلف فیہ شخصیت نہ تھے، وہ باغی کیسے ہو سکتے ہیں"۔ ①

استاذی المکرم مولانا شیخ محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"...مگر ذیل کے حقائق پر نظر ڈالتے ہوئے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے مخلص ساتھیوں اور اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دامن حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے سے بالکل پاک وصاف ہے، نہ تو انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی وہ باغی اور داعی الی النار بنے...."

اس کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے "سبائی فسادی ٹولے" کے کارناموں کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے اور پھر لکھا ہے:

"سبائی پارٹی کے شریر اور مفسد کارندے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں بھی شامل تھے اور فتنہ سازی کی خاطر

① عبقات جلد دوم، صفحہ ۳۷۹.

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بھی گھسے ہوئے تھے.....
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں داخل ہونے والے انہی فسادی لوگوں نے جو الفئة الباغية اور يدعون الى النار کا مصداق تھے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کیا.."

آگے مختلف دلائل ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"...اس سے بھی ثابت ہوا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل نہ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے اور نہ ان کی شامی فوج، یہ کاروائی عبداللہ بن سبا کے یمنی کارندوں کی تھی"۔ ①

لیکن اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"چنانچہ جب حدیث متواتر (حدیث عمار رضی اللہ عنہ تقتلك الفئة الباغية) اور خوارج سے قتال کرنے والی مشہور روایات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مصیب اور اہل شام کو مخطی ثابت کر دیا تو ائمہ مجتہدین نے بھی اسی پر فیصلہ دے دیا..." ②

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"یہاں اصابت یا خطاء دلیل ظنی سے نہیں، حدیث متواتر اور سنت مشہورہ سے ثابت ہے..." ③

بلکہ ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے ہر

① بخاری شریف کی چند ضروری مباحث ص ۴ تا ۱۳ / یہ رسالہ سیدنا شیخ کی تقریر بخاری "احسان الباری لفهم البخاری" طبع ششم ۲۰۰۹ کے آخر میں ملحق ہے۔
② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۰۳.
③ حوالہ مذکورہ ص ۸۱۹.

شخص کا بھی ہر فعل اجتہادی ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے بھی غلط فہمی اور شک وشبہے کی بنیاد پر کوئی فعل سرزد ہوسکتا ہے ایسی شخصیت اگر محترم اور جلیل القدر ہو تو بجائے اس کے کہ اس کے عمل کو کھینچ تان کر شرعی دلائل کے تحت لایا جائے، یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ کام نیک نیتی کے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا ہوکر کیا گیا، پس اگر نصوص کے خلاف کوئی کام سرزد ہو تو اسے اجتہاد نہیں، گناہ اور معصیت ہی کہا جائے گا....الخ" ①

یہاں ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب بار بار یہ لکھتے ہیں کہ" نصوص متواترہ اور مشہورہ" سے ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک فریق "قطعی مخطی" تھا، اور ظاہر ہے یہ نصوص ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی موجود تھیں، تو یوں انہوں نے ان" احادیث متواترہ ومشہورہ" کے ہوتے ہوئے ان کے خلاف کیا، تو اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق ان کے اس" خلافِ حدیثِ متواتر" عمل کو اجتہاد نہیں بلکہ" گناہ اور معصیت ہی" کہا جائے گا... پھر اس صورت میں اسے" اجتہادی خطا" کس بنیاد پر کہا جاتا ہے؟؟ اور یہ وہ سوال ہے جو رافضی اور دشمنان صحابہ اکثر کرتے بھی پائے گئے ہیں لیکن آج تک اس کا تسلی بخش جواب نہیں آیا۔

دوسرے لفظوں میں، اگر تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ اختلاف" اجتہادی" تھا تو اس صورت میں اصول اجتہاد کی روشنی میں بات کی جائے گی، اور وہاں" اجتہادی خطا وصواب" پر بات ہوسکتی ہے، لیکن اگر ایک فریق نے صریح نص متواتر کے

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۱۰۳۵.

خلاف عمل کیا اور وہ نص متواتر اس کے سامنے بھی تھی، تو بقول اسماعیل ریحان صاحب ایسے عمل کو اجتہاد نہیں بلکہ "گناہ اور معصیت" کہتے ہیں، تو پھر کیا گناہ اور معصیب کے مرتکب کو بھی "مجتہد مخطی" بتا کر ایک اجر کا مستحق بتایا جا سکتا ہے؟؟

اس گتھی کو حل کیا جانا چاہیے۔

نوٹ: یہ تمام تقریر ہم نے اسماعیل ریحان صاحب کی منطق اور نظریہ کو سامنے رکھ کر لکھی ہے لہٰذا اسے اسی تناظر میں پڑھا جائے، ہم اس بات سے سو سو بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ کسی مجتہد صحابی کے اجتہاد کو "گناہ اور معصیت" کہیں۔

ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جنگ صفین کے وقت موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس حدیث متواتر اور سنت مشہورہ کا علم تھا یا یہ حدیث متواتر اور سنت مشہورہ اس دور کے بعد دریافت ہوئیں؟؟ اگر حدیث قتل عمار (رضی اللہ عنہ) اور خوارج سے قتال کرنے والی حدیث ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم میں بھی تھیں اور یقیناً تھیں تو پھر کیا یہ سمجھا جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان احادیث کا وہ مفہوم سمجھ نہ آیا جو بعد والوں کو سمجھ آیا؟؟ اسماعیل ریحان صاحب نے تو یہی تأثر دیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عام طور پر اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر اس حدیث کا "اصل مطلب" سمجھ نہیں آیا تھا یا انہوں نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا، چنانچہ بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں: "سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اصل مطلب کو نظر انداز کیا"۔ ① پھر لکھا ہے کہ "سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی توجیہ درحقیقت درست نہیں تھی"۔ ②

پھر "متواتر متواتر" کی گردان پڑھنے والے کیا یہ بتائیں گے کہ حدیث قتل

---

①② دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۳۳۔ ۲۳۴.

عمار (رضی اللہ عنہ) میں تو کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، کیا کوئی ایسی حدیث متواتر (قطعی الدلالت) موجود ہے جس سے ثابت ہو کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے لشکر نے قتل کیا تھا؟؟ جب تک ایسی کوئی "متواتر" روایت پیش نہیں کی جاتی اس وقت تک یہ دعوی بلا دلیل ہے کہ "متواتر حدیث سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کا باغی ہونا ثابت ہے"۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر اس "متواتر حدیث" اور "سنت مشہورہ" سے مخطی اور مصیب کے قطعی فیصلے ہو چکے تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فریقین میں سے کسی ایک کے قطعی مخطی یا قطعی مصیب ہونے پر اتفاق نہ ہوا؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ انہوں نے جان بوجھ کر "حدیث متواتر" اور "سنت مشہورہ" کی خلاف ورزی کی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق نہ ہوئے؟؟ کما مرّ.

چنانچہ علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام عالم اسلام کا اجماع نہ ہوا تھا، اہل سنت کا اس خلافت پر کلی اجماع ایام خلافت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد منعقد ہوا..." ①

رہی حدیث "قتل خوارج" تو اس سے تو دونوں گروہوں کا "حق" پر ہونا ثابت ہوتا ہے، البتہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے کی بنسبت حق سے زیادہ قریب ہوگا، نیز جن حضرات نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک فریق کی "اجتہادی خطا" کا قول کیا ہے ان کے نزدیک بھی "اجتہادی خطا" حق کے دائرے میں ہی

① عبقات، ج ۲ ص ۳۷۹.

ہوتی ہے، نہ کہ "گناہ اور معصیت یا باطل" کے دائرے میں، ملاحظہ فرمائیں، حضرت مولانا قاضی مظہر حسن صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اجتہادی خطا، حق کے دائرے میں ہی رہتی ہے اس کو خلاف حق نہیں کہہ سکتے"۔ ①

"حق پر ہونے اور خطائے اجتہادی کے صدور میں کوئی تعارض نہیں ہے"۔ ②

لہٰذا اگر ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی اختلاف کو اجتہادی اختلاف" تسلیم کر کے اس کے بعد کسی ایک مجتہد فریق کے موقف کو "نص متواتر" اور "سنت مشہورہ" کا صریح مخالف بتا کر ان کے "قطعی ویقینی مخطی" ہونے کا قول کریں گے تو گویا کہ ہم نے تسلیم کرلیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر "نص متواتر" کی (جو کہ قطعی دلیل ہوتی ہے) مخالفت کی (اور یہ نص ... حدیث قتل عمار.. ان کے سامنے موجود تھی، اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا)، اور پھر نص متواتر کی جان بوجھ کر مخالفت کرنا "اجتہاد" اور "حق کے دائرے کے اندر" ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس پر "ایک اجر" ملنے کا قول کیا جاسکتا ہے، بلکہ بقول اسماعیل ریحان صاحب "گناہ اور معصیت" ہی ہوتا ہے۔ فتدبروا یا اولی الالباب.

---

① خارجی فتنہ، ج ا ص ۲۴۸ طبع دوم.

② حوالہ مذکورہ ص ۲۵۶.

جناب اسماعیل ریحان کا
علامہ ابن خلدون کی عبارت سے غلط استدلال

اسماعیل ریحان صاحب کو اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو" خلیفہ راشد" کہا جائے، اس لئے انہوں نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس موضوع پر لکھا ہے، چنانچہ ایک مقام پر عنوان قائم کرتے ہیں:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ میں کیوں شمار نہیں کیا جاتا؟"

اور پھر انہوں نے اپنے زعم کے مطابق اس بات کی چار وجوہات لکھی ہیں، سر دست ہم اسماعیل ریحان صاحب کی ان وجوہات پر بات نہیں کر رہے، وہ کسی اور مقام پر کی جائے گی، یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے مغالطہ دینے کے لیے (یہ لفظ میں نہایت مجبوری کے تحت لکھ رہا ہوں) یہاں علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ ہجری) کی ایک طویل عبارت سے صرف تقریباً ڈیڑھ سطر کاٹ کر نقل کی ہے اور اس سے ایسا استدلال کیا ہے جو علامہ ابن خلدون کی منشا کے سراسر خلاف ہے، اسماعیل ریحان صاحب کے علم میں یقیناً یہ بات تھی کہ اسی عبارت میں علامہ خلدون نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ" وہ خلفاء راشدین میں سے ہیں"، لہٰذا انہوں نے جان بوجھ کر ابن خلدون کا نام لکھا تاکہ یہ باور کروایا جائے کہ ابن خلدون بھی اسماعیل ریحان صاحب کے مفروضوں کے حامی ہیں، اور وہ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلفاء

راشدین میں شمار نہیں کرتے، آیئے اب آپ کو اسماعیل ریحان صاحب کی اس کاروائی کی تفصیل بتاتے ہیں۔

اسماعیل ریحان صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ میں کیوں شمار نہیں کیا جاتا؟" اس کی چار وجوہات لکھی ہیں، ان میں سے دوسری وجہ یوں بیان کی ہے:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا برسر اقتدار آنا، خلافت راشدہ میں انتقال اقتدار کے پروسس سے مختلف تھا، خلفائے راشدین اپنی رغبت کے بغیر جمہور اکابر امت کی رضا سے حکمران بنائے گئے، جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کوشش اور سعی کے ذریعے حکمران بنے، اکابر امت کا اتفاق رائے ہونے سے پہلے وہ اس کے لیے کوشاں تھے، بلا شبہ وہ اس کوشش میں نیک نیت اور امت کے خیر خواہ تھے مگر انتقال اقتدار کے پروسس کا یہ نمایاں فرق ان کے دور کو خلافت راشدہ سے الگ کر دیتا ہے، علامہ ابن خلدون اس بنیادی فرق کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں خلافت غلبے کی کوشش کے ذریعے حاصل کی گئی تھی، جس کی وجہ سے ان کے دور میں ابھرنے والی وہ گروہ بندی تھی جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، جبکہ اس سے قبل خلافت رضامندی اور اجتماع کے ساتھ تھی، اس لیے علما نے دونوں حالتوں میں فرق کر دیا، پس معاویہ رضی اللہ عنہ غلبے کی کوشش اور گروہ بندی کی بناء پر بننے والے پہلے خلیفہ تھے"۔

(یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے حاشیے میں علامہ ابن خلدون کی تاریخ جلد ۲ صفحہ۔ ۶۵۰ سے ایک مختصر عبارت یوں نقل کی ہے)

"أنّ الخلافة لعهده كانت مغالبة لأجل ما قدّمناه من العصبية التي حدثت لعصره، وأمّا قبل ذلك كانت اختيارا واجتماع فميّزوا بين الحالتين، فكان معاوية أوّل خلفاء المغالبة والعصبيّة". ①

اور پھر ایک دوسری جگہ صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

"اصطلاحی خلافت راشدہ کے متعلق وہ خود (یعنی ابن خلدون۔ ناقل) بتاتے ہیں کہ علماء نے اسے خلفائے اربعہ تک محدود رکھا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو اس میں شامل نہیں کیا کہ ان کی حکومت عصبیت سے پیدا شدہ مقابلے کے ذریعے وجود میں آئی تھی..... الخ" (اور پھر یہاں بھی تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۶۵۰ کی اسی ڈیڑھ سطری عبارت کا حوالہ دیا ہے) ②

اسماعیل ریحان صاحب کے ان الفاظ پر غور کریں کہ:

"مگر انتقال اقتدار کے پروسس کا یہ نمایاں فرق ان کے دور کو خلافت راشدہ سے الگ کر دیتا ہے، علامہ ابن خلدون اس بنیادی فرق کی وضاحت یوں فرماتے ہیں..."

پڑھنے والا اس سے یہی سمجھے گا کہ اس فرق کی وجہ سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۴۷ مع حاشیہ.

② حوالہ مذکورہ ص ۸۲۲۔ ۸۲۳.

دور، خلافت راشدہ سے باہر ہے، کیونکہ اسماعیل ریحان صاحب اس ساری بحث کا عنوان ہی یوں قائم کر آئے ہیں:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ میں کیوں شمار نہیں کیا جاتا؟"

اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے" چوتھی وجہ" بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صحیح احادیث میں وارد ہے: خلافة النبوة ثلاثون سنة خلافت نبوت تیس سال ہوگی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیس سال بعد والی حکومت اپنی حیثیت اور معیار کے لحاظ سے الگ ہوگی''۔ ①

قارئین محترم! آپ اسماعیل ریحان صاحب کی کتاب سے مندرجہ بالا اقتباسات پڑھ کر یقیناً یہ سمجھیں گے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو" خلافت راشدہ" سے نکالنے کی جو دوسری وجہ بیان کی ہے، اور جس کی تائید میں علامہ ابن خلدون کا حوالہ بھی دیا ہے، تو اس معاملے میں علامہ ابن خلدون بھی اسماعیل ریحان صاحب کے ساتھ متفق ہیں، اور وہ بھی اسی وجہ سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو" خلفاء راشدین" میں شمار نہیں کرتے ہوں گے، کیونکہ اسماعیل ریحان صاحب نے یہ الفاظ لکھتے ہیں:

".....مگر انتقال اقتدار کے پروسس کا یہ نمایاں فرق ان کے دور کو خلافت راشدہ سے الگ کر دیتا ہے، علامہ ابن خلدون اس بنیادی فرق کی وضاحت یوں فرماتے ہیں...الخ"

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۴۸.

اور

" اصطلاحی خلافت راشدہ کے متعلق وہ خود (یعنی ابن خلدون ۔ ناقل) بتاتے ہیں کہ علماء نے اسے خلفائے اربعہ تک محدود رکھا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو اس میں شامل نہیں کیا کہ ان کی حکومت عصبیت سے پیدا شدہ مقابلے کے ذریعے وجود میں آئی تھی"۔

اس عبارت سے پڑھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ سے نکالنے اور الگ کرنے کے لیے ابن خلدون رحمہ اللہ نے یہ بات ذکر کی ہے۔

نیز یہ ذہن میں رکھیں کہ اسماعیل ریحان صاحب نے چوتھی وجہ میں" تیس سالہ خلافت" والی ایک حدیث کو" صحیح" بتا کر بھی اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کیا ہے (ہماری بحث اس وقت اس حدیث کی صحت یا ضعف سے نہیں)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے ان دونوں مقامات پر علامہ ابن خلدون کی ایک طویل عبارت سے صرف ڈیڑھ سطر کاٹ کر اور اس کا غلط مفہوم پڑھنے والوں کے ذہن میں ڈال کر عدل و انصاف کا خون کیا ہے، علامہ ابن خلدون یہاں ہرگز یہ بحث نہیں کر رہے کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو فلاں فلاں وجہ سے" خلفاء راشدین" میں شمار نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ یہاں یہ بیان فرما رہے ہیں کہ اگرچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلفاء راشدین میں سے ہی ہیں لیکن ان کے دور حکومت کو الگ سے کیوں ذکر کیا جاتا ہے خلفاء راشدین کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کیا جاتا؟ تو اس کی وجہ آگے بیان کر رہے ہیں، یعنی یہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو الگ سے ذکر کرنے کا بیان ہو رہا ہے، نہ کہ اس بات کا کہ انہیں خلفائے راشدین

میں شمار کیوں نہیں کیا جاتا، اور اسی مقام پر علامہ ابن خلدون، آگے صریح طور پر لکھ رہے ہیں کہ "فهو من الخلفاء الراشدين" کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تو خلفاء راشدین میں سے ہی ہیں، لہٰذا آیئے ہم پہلے علامہ ابن خلدون کی مکمل عبارت سیاق وسباق کے ساتھ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علامہ ابن خلدون یہاں کیا بیان کر رہے ہیں:

"وقد كان ينبغي أن تلحق دولة معاوية وأخباره بدول الخلفاء وأخبارهم فهو تاليهم في الفضل والعدالة والصحبة، ولا ينظر في ذلك إلى حديث الخلافة بعدي ثلاثون سنة فإنه لم يصحّ، والحق أنّ معاوية في عداد الخلفاء وإنّما أخّره المؤرخون في التأليف عنهم لأمرين:

الأوّل أنّ الخلافة لعهده كانت مغالبة لأجل ما قدّمناه من العصبية التي حدثت لعصره، وأمّا قبل ذلك كانت اختيارا واجتماع فميّزوا بين الحالتين، فكان معاوية أوّل خلفاء المغالبة والعصبيّة الذين يعبّر عنهم أهل الأهواء بالملوك، ويشبّهون بعضهم ببعض وحاشى الله أن يشبّه معاوية بأحد ممّن بعده، فهو من الخلفاء الراشدين ومن كان تلوه في الدين والفضل من الخلفاء المروانية ممن تلاه في المرتبة كذلك وكذلك من بعدهم من خلفاء بني العباس، ولا يقال إنّ الملك أدون رتبة من الخلافة فكيف يكون خليفة ملكا.

واعلم أنّ الملك الّذي يخالف بل ينافي الخلافة هو

الجبروتيّة المعبر عنها بالكسرويّة التي أنكرها عمر على معاوية حين رأى ظواهرها، وأما الملك الّذي هو الغلبة والقهر بالعصبية والشوكة فلا ينافي الخلافة ولا النبوّة فقد كان سليمان بن داود وأبوه صلوات الله عليهما نبيّين وملكين وكانا على غاية الاستقامة في دنياهما وعلى طاعة ربّهما عزّ وجل. ومعاوية لم يطلب الملك ولا أبّهته للاستكثار من الدنيا، وانما ساقه أمر العصبيّة بطبعها لمّا استولى المسلمون على الدول كلها وكان هو خليفتهم فدعاهم بما يدعو الملوك إليه قومهم عند ما تستفحل العصبيّة وتدعو لطبيعة الملك. وكذلك شأن الخلفاء أهل الدين من بعده إذا دعتهم ضرورة الملك إلى استفحال أحكامه ودواعيه، والقانون في ذلك عرض أفعالهم على الصحيح من الأخبار لا بالواهي، فمن جرت أفعاله عليها فهو خليفة النبي ﷺ في المسلمين، ومن خرجت أفعاله عن ذلك فهو من ملوك الدنيا وإنما سمّي خليفة بالمجاز.

الأمر الثاني في ذكر معاوية مع خلفاء بني أمية دون الخفاء الأربعة أنهم كانوا أهل نسب واحد وعظيمهم معاوية، فجعل مع أخل نسبه، والخفاء الأوّلون مختلفو الأنساب فجعلوا في نمط واحد وألحق بهم عثمان وإن كان من أهل هذا النسب للحوقه بهم قريبا في الفضل والله يحشرنا في

زمرتهم ويرحمنا بالاقتداء بهم"۔ ①

(عبارت کا اردو میں خلاصہ)

" چاہئے تو یہ تھا کہ سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی حکومت اور ان کے حالات بھی ان سے پہلے خلفاء کی حکومتوں اور ان کے حالات کے ساتھ ہی بیان کر دیے جاتے، کیونکہ فضیلت، عدالت اور صحبت میں ان کے بعد انہی کا نمبر ہے، اور اس حدیث کی طرف توجہ نہ کی جائے جس میں ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال تک ہے، کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں، اور حق بات یہی ہے کہ سیدنا معاویہ کا شمار بھی خلفاء میں ہی ہوتا ہے، لیکن مؤرخین نے ان کا ذکر جو مؤخر کر کے (الگ سے) لکھا ہے اس کی دو وجہیں ہیں، پہلی یہ کہ ان کے زمانے میں خلافت غلبہ کی وجہ سے قائم ہوئی تھی، اس عصبیت اور گروہ بندی کی وجہ سے جس کے بارے میں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ ان کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھی، جبکہ ان سے پہلے اختیار اور اجتماع سے قائم ہوتی تھی، پس مؤرخین نے دونوں حالتوں میں تمیز کرنے کے لیے ان کا ذکر الگ کر دیا، سیدنا معاویہ ان خلفاء میں سے پہلے تھے جو غلبہ اور گروہ بندی کے ساتھ خلافت پر متمکن ہوئے، ایسے خلفاء کو ہوا پرست لوگ" بادشاہوں" سے تعبیر کرتے ہیں، اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، حاشاللہ! سیدنا معاویہ کو ان کے بعد والوں کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی، کیونکہ وہ خلفاء راشدین میں سے ہی ہیں، اسی طرح بنی مروان

① تاریخ ابن خلدون، جلد ۲ صفحہ ۶۵۰ دار الفکر بیروت۔

کے خلفاء میں سے بھی جو دین وفضل اور مرتبہ میں ان کے بعد تھے، وہ بھی اسی طرح ہیں (یعنی خلفاء راشین میں سے ہی ہیں۔ ناقل)، اور اسی طرح ان کے بعد بنی عباس کی خلفاء میں سے بھی ہیں، لہٰذا یہ نہ کہا جائے کہ بادشاہت خلافت سے مرتبہ میں کم ہے اس لیے خلیفہ بادشاہ کیسے ہوسکتا ہے؟. جان لو کہ! جو ملوکیت (بادشاہت) خلافت کے منافی ہے وہ جبروتیت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے ایک بار سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے (سیدنا معاویہ کی گورنری کے زمانہ میں۔ ناقل) ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ناپسند فرمایا تھا، لیکن وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے، سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد داود علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے کاموں میں نہایت استقامت والے اور اپنے رب کی اطاعت کے پابند تھے. سیدنا معاویہ نے بادشاہت کے طور اطوار دنیا کے لئے نہیں اپنائے (بلکہ مملکت کی طبعی صورت حال کے لازمی تقاضے کی پاسداری کرتے ہوئے ایسا کیا۔ ناقل) اور ان کو اس امر پر فطری گروہ بندی نے ابھارا تھا جب مسلمانوں نے تمام سلطنتوں پر تسلط حاصل کرلیا تھا اور یہ ان کے خلیفہ تھے، پس انہوں نے بھی لوگوں کو اس بات کی طرف بلایا جیسے تمام بادشاہ اپنی قوم کو طبعی گروہ بندی اور عصبیت کی وجہ سے بلاتے ہیں۔ اور ایسا ہی حال سیدنا معاویہ کے بعد دین دار خلفاء کا بھی ہے جب امور سلطنت چلانے کی ضرورت داعیہ پیدا ہوئی تو انہوں نے ایسا ہی

کیا۔ اس بارے میں اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ ان خلفاء کے افعال کو احادیث صحیحہ پر پیش کیا جائے گا نہ کہ خرافات و واہیات پر، پس جن کے افعال احادیث صحیح کے مطابق ہوں گے وہ مسلمانوں میں نبی ﷺ کا خلیفہ شمار ہوگا، اور جس کے افعال اس سے خارج ہوں گے وہ دنیاوی بادشاہوں میں شمار ہوگا جسے صرف مجازی طور پر خلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔

دوسری وجہ (جس کے سبب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکومت اور آپ کے حالات کو خلفاء اربعہ سے الگ کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ ناقل) یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ ایک ہی نسب اور ایک ہی خاندان سے تھے، ان سب کے بڑے سیدنا معاویہ تھے (پس یہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ ذکر کیے گئے) اور خلفاء سابقین مختلف خاندانوں کے تھے اس لیے ان کو ایک ساتھ الگ سے ذکر کیا گیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ (اگرچہ وہ اموی تھے۔ ناقل) لیکن چونکہ وہ فضیلت و مرتبے میں انہیں کے قریب تھے اس لیے ان کا ذکر بھی انہی کے ساتھ کر دیا گیا. اللہ ہمارا حشر بھی ان کے زمرہ میں کرے اور ان کی اقتداء کرنے کی وجہ سے ہم پر رحم کرے۔

قارئین محترم! علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کی اس ساری عبارت سے مندرجہ ذیل باتیں سمجھ آتی ہیں:

۱۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، ان کے نزدیک بلاشبہ خلفاء راشدین میں سے ہیں۔

۲۔ ان کے نزدیک "تیس سالہ خلافت" والی حدیث صحیح نہیں ہے۔

۳۔ ان کے نزدیک مطلق "خلافت" اور مطلق "ملوکیت" (بادشاہت) میں کوئی فرق نہیں، اور نہ ہی مطلق "ملوکیت" کا مرتبہ "خلافت" سے کم ہے۔

۴۔سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت جس غلبہ اور گروہ بندی کے ذریعے قائم ہوئی، ایسی خلافت کو" ہوا پرست" لوگ" ملوکیت" کہتے ہیں۔

۵۔وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے۔

۶۔علامہ ابن خلدون کے مطابق، نہ صرف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، خلیفہ راشد ہیں، بلکہ ان کے بعد کے خلفاء میں بھی جو دین دار ہوئے ہیں، اور ان کے اعمال وافعال احادیث صحیحہ کے موافق ہوں وہ بھی خلفاء راشدین ہیں۔

۷۔علامہ ابن خلدون کے مطابق مؤرخین نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا ذکر، پہلے خلفاء سے الگ اس لیے نہیں کیا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار خلفاء راشدین میں شمار نہیں ہوتا، بلکہ ان کا ذکر دو وجہ سے الگ کیا جاتا ہے، ایک تو اس لئے کہ پہلے چاروں خلفاء الگ الگ خاندانوں سے تھے، اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے چونکہ ایک ہی خاندان کی خلافت کا آغاز ہوا اس لئے ان کا ذکر اپنے خاندان کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، نیز چونکہ ان کی خلافت قائم ہونے میں غلبہ اور گروہ بندی کو بھی دخل تھا اس لیے بھی ان کا ذکر الگ سے کر دیا جاتا ہے۔

قارئین محترم! آپ نے دیکھا کہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ، بالکل اسماعیل ریحان صاحب کے نظریہ کے الٹ بات لکھ رہے ہیں، وہ تو یہ بتا رہے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ راشد ہیں، اس لئے ان کا ذکر بھی پہلے خلفاء کے ساتھ بھی ہونا چاہئے تھا، لیکن مؤرخین نے ان کا ذکر الگ سے مذکورہ دو سبب سے کیا ہے، نیز وہ " تیس سالہ خلافت" کے بارے میں لکھ رہے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے لہٰذا اس کی بنیاد پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو" خلافت راشدہ" سے خارج کرنا درست

نہیں. جبکہ اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلفاء راشدین سے نکالنے کے لیے چوتھی دلیل ہی یہ حدیث ہی پیش کی ہے۔

تو انصاف کا تقاضا تھا کہ اس بحث میں اسماعیل ریحان صاحب، کم از کم علامہ ابن خلدون کا حوالہ بالکل نہ دیتے، اور اگر دینا ہی تھا تو ان کا مکمل موقف بیان کرتے، صرف ڈیڑھ سطر نقل کر کے آگے نہ چلتے۔

ایک کٹ حجتی اور اس کا جائزہ

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کا موقف اور رائے درست ہے یا غلط، یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو" خلفائے راشدین" سے باہر نکالنے کے لیے جو علامہ ابن خلدون کا حوالہ پیش کیا ہے یہ علمی خیانت کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ علامہ ابن خلدون نے صراحت کے ساتھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلفائے راشدین میں سے ہی لکھا ہے، اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی کتاب میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ" تیس سالہ خلافت والی حدیث صحیح نہیں ہے" یعنی وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو اسی خلافت میں شامل بتاتے ہیں جس خلافت سے انہیں تیس سالہ خلافت والی حدیث کی بنیاد پر نکالا جاتا ہے۔

لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے اپنی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ ابن خلدون کے نزدیک بھی خلافت راشدہ دو قسم پر ہے، ایک اصطلاحی خلافت راشدہ، اور دوسری لغوی خلافت راشدہ، اور اصطلاحی خلافت راشدہ تو ان کے نزدیک بھی صرف خلفائے اربعہ میں منحصر ہے، اور انہوں نے جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا دوسرے خلفاء کو بھی خلفائے راشدین میں بتایا ہے، اس سے مراد ان کی" لغوی خلافت راشدہ ہے"۔

اس بات پر دلیل یہ پیش کی جارہی ہے کہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں خود

علامہ ابن خلدون نے تیس سالہ خلافت والی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" خلافت شرعیہ تو آنحضرت ﷺ کے بعد بہت تھوڑے عرصہ کے لیے رہی تھی"، جس سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک اصطلاحی خلافت راشدہ صرف تیس سال تک ہی تھی، اور یہاں وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بلکہ ان کے بعد ہونے والے دین دار خلفاء کو بھی خلفائے راشدین میں شمار کر رہے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ لغوی خلافت راشدہ کی بات کر رہے ہیں، لہٰذا علامہ ابن خلدون کی رائے جمہور سے متصادم نہیں ہے۔ ①

تو عرض ہے کہ یہ" اصطلاحی خلافت راشدہ" اور" لغوی خلافت راشدہ" کی تقسیم کس بنیاد پر کی جاتی ہے؟ کیا قرآن کریم یا کسی حدیث میں یہ دو قسم کی خلافت راشدہ کہیں بیان ہوئی ہے؟؟ کیا کسی آیت قرآنیہ میں" اصطلاحی خلافت راشدہ" کا ذکر ہے یا تیس سالہ خلافت والی حدیث میں" خلافت" کے ساتھ "راشدہ" یا" اصطلاحی" کی قید مذکور ہے؟؟

دوسری بات یہ کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ کے بعد اپنی کتاب میں صریح طور پر یہ لکھا ہے کہ" اگرچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلفائے راشدین میں سے ہیں، لیکن ان کے دور کو الگ چند دیگر وجوہ کی بنا پر ذکر کیا جاتا ہے" (ان کی مفصل عبارت پہلے نقل ہو چکی) اس عبارت سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی خلفائے اربعہ کی طرح کا خلیفہ راشد سمجھتے ہیں، ورنہ وہ یہاں یوں فرماتے کہ" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس لیے خلفائے اربعہ سے الگ ذکر کیا جاتا ہے کہ کیونکہ ان کی خلافت، خلافت راشدہ

① ملخصاً: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۳۔ ۸۲۴.

اصطلاحی نہیں تھی بلکہ لغوی خلافت راشدہ تھی"۔

تیسری گذارش یہ ہے کہ مقدمہ کے بعد جب علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب کے اگلے حصہ میں اس موضوع پر لکھا تو وہاں صاف طور پر لکھ دیا کہ" تیس سالہ خلافت والی حدیث کی طرف توجہ نہ دی جائے کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں"، تو اب اگر بالفرض انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس حدیث سے کسی بات پر استدلال بھی کیا تھا تو اب اس کی کوئی حیثیت نہ رہی، ممکن ہے کہ مقدمہ لکھتے وقت ان پر یہ بات واضح نہ ہوئی ہو کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

چوتھی گذارش یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب اور ان کے ہم نوا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو" لغوی خلافت راشدہ" کے مفہوم میں لے کر انہیں " خلیفہ راشد" کہنے پر معترض تو نہیں ہوں گے؟؟ کیا اگر کوئی بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ" خلیفہ راشد" لکھے تو یہ حضرات فوراً اسے ٹوکیں گے تو نہیں کہ" حدیث میں آتا ہے کہ خلافت صرف تیس سال تک تھی"، لہٰذا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو" خلیفہ راشد" تو دور کی بات، صرف" خلیفہ" بھی نہیں کہا جائے گا، بلکہ" ملک" (بادشاہ) کہا جائے گا (جیسا کہ بعض حضرات نے صراحت کے ساتھ لکھا بھی ہے)، کیونکہ اسی حدیث میں ہے کہ" تیس سال کے بعد ملوکیت ہوگی"؟؟ تو اگر اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک" تیس سال" کے بعد والے کسی حکمران کے لیے لغوی معنی میں " خلیفہ راشد" یا صرف" خلیفہ" کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے تو کیا یہ بات تیس سالہ خلافت والی حدیث کی مخالفت نہیں شمار ہوگی؟ یاد رہے! اس حدیث میں" مطلق خلافت" کے تیس سال تک ہونے کا ذکر ہے، یہاں" راشدہ" کی کوئی قید نہیں، اور پھر تیس سال کے بعد" خلافت" کے بجائے" ملوکیت" کا ذکر ہے۔ بینوا توجروا.

اور اگر تیس سالہ مدت کے بعد میں ہونے والے کسی حکمران کو لغوی معنی میں بھی "خلیفہ راشد" یا صرف "خلیفہ" کہنا اسی تیس سالہ خلافت والی حدیث کی رو سے درست نہیں ہے، تو پھر ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو (لغوی معنی میں ہی سہی) تیس سالہ مدت کے بعد کسی اور کو "خلیفہ راشد" لکھتے ہیں؟؟ یا صرف "خلیفہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں؟؟

نوٹ: اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو "خلافت راشدہ" سے خارج کرنے کے لیے اس تیس سالہ خلافت والی حدیث سے بطور خاص استدلال کیا ہے، اس لیے ان سے یہ سوال کیے گئے ہیں۔

الغرض! علامہ ابن خلدون کی تمام عبارات کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت راشدہ، تیس سال میں منحصر نہیں، اور نہ ہی ان کے نزدیک خلافت راشدہ کی دو قسمیں (ایک اصطلاحی اور دوسری لغوی) ہیں، بلکہ ان کے نزدیک تو مطلق "خلافت" اور مطلق "ملوکیت" (بادشاہت) میں کوئی فرق نہیں، اور نہ ہی مطلق "ملوکیت" کا مرتبہ "خلافت" سے کم ہے۔

ہاں اگر اسماعیل ریحان صاحب بجائے علامہ ابن خلدون کی عبارت کی ڈیڑھ سطر نقل کر کے یہ باور کروانے کے کہ وہ بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ سے خارج سمجھتے ہیں، پہلے ہی وہ الفاظ لکھ دیتے جو انہوں نے اپنی کتاب کے میں بطور آخری نتیجہ لکھے ہیں تو اور بات تھی، وہ لکھتے ہیں:

"ابن خلدون رحمہ اللہ فن حدیث کے ماہرین میں شمار نہیں ہوتے، جب کوئی شخص اپنے میدان سے ہٹ کر رائے زنی کرتا ہے تو وہ لغزش کا

شکار ہوسکتا ہے، یہاں بھی ان کی لغزش کھلی ہوئی ہے.....ان کا اس حدیث کو "لا ینظر" کہنا نہ صرف جمہور کی اجتماعی رائے کے مقابلے میں کسی طرح درست نہیں بلکہ وہ خود جگہ جگہ اپنی اس رائے کے خلاف تحقیقات پیش کر چکے ہیں"۔ ①

اس اقتباس میں اسماعیل ریحان صاحب خود یہ اقرار کر چکے ہیں کہ علامہ ابن خلدون کا نظریہ اور رائے ہرگز وہ نہیں جو ان کا ادھورا حوالہ دے کر اسماعیل ریحان صاحب نے باور کروانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ سردست ہماری بحث اس سے نہیں کہ اس "تیس سالہ خلافت" والی حدیث کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟ اور کیا صرف علامہ ابن خلدون نے اسے "غیر صحیح" بتایا ہے؟ نیز صحت میں اس سے زیادہ قوی احادیث میں تو "کثیر تعداد میں خلیفے" ہونے کا بھی ذکر ہے نیز احادیث صحیحہ میں ایسے بارہ خلیفوں کا بھی ذکر ہے جن کے دور میں اسلام مضبوط اور غالب رہنے کی بشارت دی گئی ہے، اب اگر "خلافت" کو صرف چار میں منحصر کر دیا جائے تو ان دوسری احادیث کا جو کہ ہر لحاظ سے "تیس سالہ خلافت" والی حدیث سے زیادہ صحیح ہیں ان کا کیا جائے گا؟؟ جس پر مختصر طور پر چند گذارشات ہم پیش کرتے ہیں۔

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۵.

بارہ خلفاء والی حدیث
اور اسماعیل ریحان صاحب کی "نئی" تحقیق

جناب اسماعیل ریحان صاحب "بارہ خلفاء کی حدیث" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"دوسری طرف بعض صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ تیس سال کے بعد بھی خلفاء کا سلسلہ جاری رہے.." ①

اس کے بعد انہوں نے سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تین مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"یہ دین سر بلند اور قائم رہے گا، یہاں تک کہ اس میں بارہ خلفاء گزریں گے جو قریشی ہوں گے"۔

اور پھر لکھا ہے کہ:

"جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو عامر بن سعد، سماک، سعید الہمدانی، عبد الملک بن عمیر، امام شعبی رحمہ اللہ اور دوسرے بہت سے تابعین نے نقل کیا ہے"۔

اور پھر سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے جس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بارہ خلفاء ایسے ہوں گے جن پر امت جمع ہو جائے گی"۔ ②

① ② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۴۷۔۸۴۸.

اس کے بعد جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"پس الخلافة ثلاثون سنة کی روایت کو صحیح مانتے ہوئے، اس کا مطلب بارہ خلفاء کی حدیث کی روشنی میں سمجھنا چاہئے، دونوں حدیثوں کے درمیان ظاہری تعارض کو دور کرنے کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اسلامی خلافت صرف چار خلفاء پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا، جس میں بارہ ایسے نامور خلفاء کا ظہور طے ہے جن پر پوری امت کا اتفاق ہو اور ان کے دور میں اسلام سربلند اور غالب ہو، ان خلفاء میں سے کئی گذر چکے ہیں، اور کچھ بعد میں آئیں گے، گذرنے والے بہترین خلفاء میں سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی، سیدنا علی المرتضی" سیدنا حسن اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام کسی طرح ترک نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان کے دور میں مسلمان جس طرح متحد اور فتح مند رہے اس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے"۔ ①

قارئین محترم!

جناب اسماعیل ریحان صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کو ایک بار پھر غور سے پڑھ لیں، اس میں وہ یہ بتا رہے ہیں کہ:

۱۔ اسلامی خلافت صرف چار خلفاء پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

۲۔ بارہ ایسے خلفاء کا ظہور طے ہے جن پر پوری امت کا اتفاق ہو۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۴۸.

۳۔ان بارہ خلفاء کے دور میں اسلام سربلند اور غالب رہنا بھی طے ہے۔

۴۔آج سنہ ۱۴۴۱ ہجری مطابق ۲۰۲۰ عیسوی میں اسماعیل ریحان صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ ان بارہ میں سے کچھ گزر چکے ہیں اور کچھ بعد میں (یعنی جب وہ یہ تحریر لکھ رہے ہیں اس کے بعد) آئیں گے۔

۵۔ پھر انہوں نے کچھ نام گنوائے ہیں جو ان کے نزدیک ان بارہ خلفاء میں سے اب تک گذر چکے ہیں، اور یہ لکھا ہے کہ ان سب کے دور میں مسلمان متحد رہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسماعیل ریحان صاحب نے یہاں کسی قدیم شارح حدیث کا حوالہ نہیں دیا کہ انہوں نے اس حدیث کی شرح میں کیا لکھا ہے، اور کیا کیا نام گنوائے ہیں، بلکہ صرف اپنی ایک" جدید تحقیق" ہی لکھی ہے، کیونکہ اکثر شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح میں بارہ کے بارہ خلفاء کے نام گنوائے ہے، اور ان کے نزدیک یہ سارے بارہ کے بارہ گذر چکے ہیں، جس کا ذکر اسماعیل ریحان صاحب نے اس لئے نہیں کیا کہ کسی کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ کئی شراح حدیث نے ان بارہ خلفاء میں بہت سے اموی خلفاء کو بھی شامل کیا ہے، آیئے چند حوالے دیکھتے ہیں:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَإِيضَاحُ ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِالِاجْتِمَاعِ انْقِيَادُهُمْ لِبَيْعَتِهِ وَالَّذِي وَقَعَ أَنَّ النَّاسَ اجْتَمَعُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ عَلِيٍّ إِلَى أَنْ وَقَعَ أَمْرُ الْحَكَمَيْنِ فِي صِفِّينَ فَسُمِّيَ مُعَاوِيَةُ يَوْمَئِذٍ بِالْخِلَافَةِ ثُمَّ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَى مُعَاوِيَةَ عِنْدَ صُلْحِ

الْحَسَنِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى وَلَدِهِ يَزِيدَ وَلَمْ يَنْتَظِمْ لِلْحُسَيْنِ أَمْرٌ بَلْ قُتِلَ قَبْلَ ذَلِكَ ثُمَّ لَمَّا مَاتَ يَزِيدُ وَقَعَ الِاخْتِلَافُ إِلَى أَنِ اجْتَمَعُوا عَلَى عبد الْملك بن مَرْوَان بعد قتل بن الزُّبَيْرِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى أَوْلَادِهِ الْأَرْبَعَةِ الْوَلِيدِ ثُمَّ سُلَيْمَانَ ثُمَّ يَزِيدَ ثُمَّ هِشَامٍ وَتَخَلَّلَ بَيْنَ سُلَيْمَانَ وَيَزِيدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَهَؤُلَاءِ سَبْعَةٌ بَعْدَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالثَّانِي عَشَرَ هُوَ الْوَلِيدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عَمُّهُ هِشَامٌ..." ①

(خلاصہ) ان بارہ کی خلافت پر امت کے اجتماع سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی بیعت کرلیں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کا اجتماع سیدنا ابوبکر، پھر سیدنا عمر، پھر سیدنا عثمان پھر سیدنا علی (رضی اللہ عنہم) پر ہوا، پھر ان کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوا، پھر ان کے بیٹے یزید بن معاویہ پر ہوا، پھر یزید کی وفات کے بعد اختلاف رہا، یہاں تک کہ پھر لوگ سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد، عبدالملک بن مروان پر مجتمع ہوئے، پھر عبدالملک کے چاروں بیٹوں ولید، سلیمان، یزید اور ہشام پر اجتماع ہوا، ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز بھی آتے ہیں، تو خلفاء راشدین کے بعد یہ سات خلفاء ہوئے، اور بارہواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک ہوا جس پر لوگوں کا اجتماع ہوا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (المتوفی ۷۲۸) فرماتے ہیں:

---

① فتح الباری، ج ۱۳ ص ۲۱۵ دار المعرفة بیروت.

"وفي لفظ: لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثني عشر خليفة كلهم من قريش وهكذا كان، فكان الخلفاء: أبو بكر، وعمر، وعثمان، وعلي، ثم تولى من اجتمع الناس عليه وصار له عز ومنعة: معاوية، وابنه يزيد، ثم عبد الملك وأولاده الأربعة، وبينهم عمر بن عبد العزيز. وبعد ذلك حصل في دولة الإسلام من النقص ما هو باق إلى الآن، فإن بني أمية تولوا على جميع أرض الإسلام، وكانت الدولة في زمنهم عزيزة"۔

اور اس حدیث کے بعض الفاظ ہیں: "اسلام غالب رہے گا بارہ خلفاء تک جو سب کے سب قریش سے ہوں گے" اور ایسے ہی ہوا چنانچہ یہ خلفاء اس طرح تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ان کے بعد جن پر امت جمع رہی اور اس کے لئے عزت وطاقت رہی، وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے یزید، پھر عبدالملک اور پھر اس کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیاں عمر بن عبدالعزیز بھی تھے۔ اور اس کے بعد اسلامی حکومت میں نقص آ گیا جو آج تک باقی ہے، اور بنوامیہ نے تمام عالم اسلام پر حکومت کی اور اسلامی حکومت ان کے زمانے میں مضبوط تھی"۔ ①

ملا علی القاری (متوفی ۱۰۱۴ ہجری) فرماتے ہیں:

"وكان الأمر كما قال النبي ﷺ، فالإثني عشر هم الخلفاء الراشدون الأربعة، ومعاوية وابنه يزيد، وعبدالملك بن

① منهاج السنة، جلد ۸، صفحه ۲۳۸، طبع السعودية.

مروان و أولاده الأربعة، وبينهم عمر بن عبدالعزيز، ثم أخذ الأمر في الإنحلال، وعند الرافضة أن أمر الأمة لم يزل في أيام هؤلاء فاسداً منغصاً يتولاه الظالمون المعتدون، بل المنافقون الكافرون وأهل الحق أذل من اليهود، وقولهم ظاهر البطلان، والله المستعان". ①

"اور معاملہ ویسے ہی ہوا جیسے نبی ﷺ نے فرمایا تھا، چنانچہ بارہ خلیفہ یہ چار خلفائے راشدین تھے، اس کے بعد معاویہ اور ان کے بیٹے یزید تھے، اس کے بعد عبدالملک بن مروان اور ان کے چاروں بیٹے تھے اور ان کے درمیاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے، اس کے بعد یہ معاملہ کمزور پڑ گیا، جبکہ روافض کا کہنا ہے کہ ان تمام کے دور میں امت کے معاملات خراب تھے اور ظالموں کے ہاتھ میں تھے، بلکہ منافقوں اور کافروں کا تسلط تھا جبکہ اہل حق یہودیوں سے بھی زیادہ ذلت کے ساتھ رہ رہے تھے، ان (رافضیوں) کی اس بات کا باطل ہونا ظاہر ہے، والله المستعان۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"علمائے اہل سنت میں قاضی عیاض رحمہ اللہ اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفائے راشدین اور بنوامیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گناتے

① مِنح الروض الأزهر في شرح الفقه، صفحه ٢٠٦، دار البشائر الاسلامية بيروت

ہیں جن کی خلافت پر تمام امت کا اجتماع رہا یعنی سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہم، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی، ہشام"۔ ①

یہ ان لوگوں کی تحقیق ہے جو اسماعیل ریحان صاحب سے بہت پہلے کے ہیں، لیکن اسماعیل ریحان صاحب نے ان حوالوں کا ذکر تک نہیں کیا اور چار پانچ نام لے کر آگے چل پڑے ہیں، کیا ایک "غیر جانبدار" مؤرخ کو یہ بات زیب دیتی ہے؟

اب غور کریں! ایک تو ان سب نے وہ بارہ خلفاء نام کے ساتھ گنوائے ہیں جن پر ان کی تحقیق کے مطابق امت کا اجتماع ہوا، اور جن کے دور میں ان حضرات کے مطابق اسلام سربلند اور غالب رہا.. اور ان ناموں میں ان قدیم علماء میں سے کسی نے بھی نہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا نام لکھا اور نہ ہی سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا نام لکھا، کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ان پر امت کا اتفاق و اجتماع نہیں ہو سکا تھا، اور دوسرا ان سب نے "یزید بن معاویہ" کا نام ان بارہ خلفاء میں ذکر کیا جن پر ان کے مطابق امت کا اجتماع ہو گیا تھا... نیز ان قدیم شارحین میں سے کسی نے نہیں کہا کہ ان بارہ میں سے کچھ خلفاء تو گذر چکے ہیں، اور کچھ باقی ہیں، بلکہ انہوں نے بارہ کے بارہ خلفاء کے نام گنوا دیے ہیں، کیا اسماعیل ریحان صاحب کو یہ بات بیان نہیں کرنی چاہئے تھی کہ فلاں فلاں شراح حدیث نے یہاں فلاں فلاں نام گنوائے ہیں؟؟

اب سوال یہ ہے کہ کس کی تحقیق درست مانی جائے؟ حافظ ابن حجر، ملا علی

① سیرت النبی: جلد ۲، صفحہ ۳۹۳، ادارہ اسلامیات پاکستان۔

قاری، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور سید سلیمان ندوی صاحب (رحمہم اللہ) کی یا آج کے محقق جناب اسماعیل ریحان صاحب کی؟؟ یا کس کی تحقیق کو" راجح" قرار دیا جائے؟؟ نیز کیا اسماعیل ریحان صاحب یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت پر اجتماع امت ہوا تھا؟ اگر ہوا تھا تو پھر ان شارحین نے ان کا نام کیوں ان بارہ خلفاء میں ذکر نہیں کیا؟

کیا حافظ ابن حجر و ملا علی قاری و شیخ ابن تیمیہ وغیرہم (رحمہم اللہ) کی تحقیق سے آج کے مؤرخ اسلام صاحب متفق نہیں؟

اسماعیل ریحان صاحب کا عجوبہ

آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہاں اسماعیل ریحان صاحب نے بارہ خلفاء والی حدیث پر بات کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

"اسلامی خلافت صرف چار خلفاء پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا، جس میں بارہ ایسے نامور خلفاء کا ظہور طے ہے جن پر پوری امت کا اتفاق ہو اور ان کے دور میں اسلام سربلند اور غالب ہو"۔ ①

لیکن اس سے پہلے وہ یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

"یہاں معاملے کا یہ پہلو بھی اوجھل نہیں ہونا چاہئے کہ اکثر جلیل القدر علماء نے خلفائے راشدین (اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک خلفائے راشدین صرف چار ہیں۔ ناقل) کے بعد کے حکمرانوں کو حقیقی خلفاء تسلیم نہیں کیا اور فقط ناگزیر حالت کی وجہ سے ان کے لیے خلیفہ کا لقب استعمال کرنا جائز سمجھا ہے"۔ ②

لیجئے! بارہ خلفاء والی حدیث سے یہ ثابت کیا کہ "اسلامی خلافت صرف چار پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا"..اور اب حدیث

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۴۸.
② حوالہ مذکورہ ص ۸۲۶.

کے مقابلے میں "جلیل القدر علماء" کا حوالہ دے کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد کوئی بھی حکمران "حقیقی خلیفہ" نہیں، (جبکہ بارہ خلفاء والی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ان بارہ کو خلیفہ کے لفظ سے ہی بیان فرمایا ہے) اور پھر چونکہ اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک خلفاء راشدین صرف چار ہیں، تو یوں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی "حقیقی خلافت" نہ رہی... لیکن ٹھہریئے! اسماعیل ریحان صاحب تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حکومت کو "آئینی" لکھتے ہیں اور ان کے مقابل سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو "غیر آئینی" لکھتے ہیں، چنانچہ رقمطراز ہیں:

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ایک متوازی غیر آئینی حکومت تھی، دونوں حکومتوں کے سربراہوں کی خواہش تھی امت مسلمہ ایک خلیفہ پر متفق ہو جائے مگر ایسے میں امت مسلمہ کے نمائندہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ امت کے بہترین فرد کا انتخاب کرتے"۔ ①

نیز وہ تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو "خلافت راشدہ" ہی لکھتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

"مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ، دنیوی بادشاہ نہیں، ان خلفائے راشدین کا تتمہ اور عکس تھے جن کا اقتدار ذات، غرض، نفس، خواہش اور مفاد جیسے مفاہیم سے ناآشنا تھا، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جس بے مثال ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا وہ ایک خلیفہ راشد ہی کے بس کی بات تھی.." ②

تو کیا اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی "حقیقی خلافت" تھی یا نہیں؟؟

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۵.
② حوالہ مذکورہ ص ۳۴۹.

بنی امیہ دشمنی

جناب اسماعیل ریحان صاحب" بنو امیہ" دشمنی میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے ایک ہی صفحہ پر تضاد در تضاد کا شکار نظر آتے ہیں:

خلافت راشدہ پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب ہم یہاں سائل سے بطور الزام یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ علمائے اہل سنت کی اصطلاح کو توڑ کر آپ خلافت راشدہ کی اصطلاح کس اصول پر قائم کرنا چاہتے ہیں؟ آیا اس اصول پر کہ ہر حکمران صحابی خلیفہ راشد ہے؟ تو پھر اس صورت میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت راشدہ میں شامل کریں گے یا نہیں؟

اگر شامل کریں گے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تا دم آخر جس گروہ سے لڑتے رہے وہ یہی بنو امیہ کا گروہ تھا، یزید تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے دو بار جنگ کر چکا تھا، اسے آپ کیا حیثیت دیں گے؟ مروان کو کیا کہیں گے؟

یزید اور اس کے بیٹے کی موت کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے، رجب ۶۴ ہجری میں تمام صوبوں میں ان سے بیعت کر لی گئی اب وہ خلیفہ راشد تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کے مخالفین کی پوزیشن کیا مانی جائے گی؟

اور اگر کوئی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس لئے خلیفہ راشد نہ مانے کہ ان کی خلافت پورے عالم اسلام پر قائم نہ ہوئی تھی تو اس دلیل کے مطابق اسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کا بھی انکار کرنا پڑے گا جو شام پر قابض نہ ہو سکے..." ①

یہ مکمل عبارت دوبارہ پڑھ لیں، اور پھر ان سوالوں کے جواب درکار ہیں:

سوال نمبر ۱:

اسماعیل ریحان صاحب نے ذکر کیا کہ" یزید تو عبداللہ بن زبیر سے دو بار جنگ کر چکا تھا"، اور وہ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس وقت یزید کی کیا حیثیت تھی؟ لیکن اگلی ہی سطر میں لکھتے ہیں کہ:" سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تو صرف یزید نہیں بلکہ اس کے بیٹے (معاویہ بن یزید) کی بھی وفات کے بعد سنہ ۶۴ ہجری میں خلیفہ بنے تھے"، یعنی جب یزید نے (بقول اسماعیل ریحان صاحب) ان سے جنگ کی تو اس وقت وہ خود خلیفہ نہیں تھے، جب وہ اس وقت خلیفہ ہی نہیں تھے تو پھر یزید کو " خلیفہ راشد کے خلاف" جنگ کرنے والا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اب ایک سوال کا جواب اسماعیل ریحان کو دینا ہے کہ سنہ ۶۰ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سے رجب سنہ ۶۴ ہجری سے پہلے تک کے عرصے میں امت مسلمہ کا خلیفہ کون تھا؟ اور اس خلیفہ کے خلاف جنگ کرنے والوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ اگر امت اس عرصہ چار سال میں بغیر خلیفہ اور امیر کے رہی تو بھی بتایا جائے، اور اگر کہا جائے کہ جو بھی خلیفہ تھا اس کی خلافت کو سب نے قبول نہیں کیا تھا، تو کیا جس کی خلافت سب قبول نہ کریں وہ خلیفہ نہیں ہوگا؟ سوچ کر سمجھ کر جواب درکار ہے..

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۸.

آپ نے بھی کچھ اسی قسم کی منطق بکھیری ہے۔

سوال نمبر ۲:

دوسرا سوال یہ کہ اسماعیل ریحان صاحب نے لکھا ہے کہ:

" حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی رجب ۶۴ ہجری میں (اسلامی ریاست کے) تمام صوبوں میں بیعت کر لی گئی تھی"۔

جس کا مطلب ہے کہ اس وقت کی اسلامی ریاست کے تمام علاقوں میں ان کی خلافت قائم ہو چکی تھی، جبکہ اگلی ہی سطر میں وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ" عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت پورے عالم اسلام پر قائم نہیں ہوئی تھی" (اسی کو تسلیم کرتے ہوئے وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ: اگر کوئی عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو اس لئے خلیفہ راشد نہ مانے کہ ان کی خلافت پورے عالم اسلام پر قائم نہیں ہوئی تھی..... الخ)...تو کیا یہ دو سطروں میں ہی تضاد نہیں؟

نیز آنجناب پہلے سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے سقوط کے اسباب میں یہ لکھ آئے ہیں کہ:

" مرکز خلافت کا صوبوں سے مربوط تعلق نہ تھا، بلکہ صوبے دار اپنے معاملات خود طے کرتے تھے....خود مختاری کے اس ماحول میں امراء کے لئے آسان تر تھا کہ جب حریف کا دباؤ بڑھے یا پر کشش مراعات ملیں تو اس کی صف میں چلے جائیں"۔ ①

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت صوبوں میں بھی مکمل قائم نہ تھی، بلکہ طوائف الملوکی کا دور تھا، اور صوبے دار خود مختار

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۲۱.

تھے... کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حکومت جن صوبوں پر قائم تھی ان کے صوبے دار بھی اس طرح خود مختار تھے کہ وہ خود سے فیصلے کرتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کا موازنہ، خلافت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کیوں کیا جا رہا ہے؟

نوٹ: ہم یہاں اس بات پر ہرگز بحث نہیں کر رہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما "راشد" تھے یا نہیں.. ہمارے نزدیک ہر صحابی "راشد" ہے.. وہ خلیفہ بنے تو بھی "راشد" ہے، نہ بنے تو بھی راشد" ہے، بلکہ جو بھی حکمران قرآن وسنت اور شریعت مطہرہ کو اپنی حکومت میں نافذ کرے، اور قانون الٰہی پر عمل کرے کرائے وہ خلیفہ راشد ہی ہے... نہ ہی ہم یہاں" خلافت موعودہ" و" غیر موعودہ" کی بات کر رہے ہیں، سر دست ہم صرف اسماعیل ریحان صاحب کی " دوغلی" پالیسی کو اجاگر کر رہے ہیں... ان کی دورنگی بتانا مقصد ہے...

ظاہری بغاوت، صوری بغاوت اور حقیقی بغاوت، اور جناب اسماعیل ریحان صاحب کی ایک تلبیس کا ازالہ

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ بعض اکابر کی تحریرات میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ صورتاً بغاوت تھی، یا وہ بظاہر باغی تھے، یا صورتاً باغی تھے، جس کا مطلب ہے وہ حقیقت میں بغاوت نہ تھی، اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"ان دونوں تعبیرات میں کوئی تضاد نہیں، عام تعبیر میں جہاں صورتاً کی قید نہیں، وہاں مراد یہ ہے کہ شرعی اصطلاح کے لحاظ سے فی الواقع یہ بغاوت تھی، اسی لئے فریق مقابل پر بغاۃ کے شرعی احکام جاری بھی ہوئے اور انہی جنگوں سے فقہاء نے حقیقی بغاوت کے شرعی مسائل کا استنباط بھی کیا۔ جہاں تک صورتاً بغاوت یا بظاہر بغاوت کی تعبیر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصطلاحی بغاوت کا انکار کیا جا رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے اقدامات میں "روح بغاوت" موجود نہ تھی فقط اس کا ڈھانچہ تھا" .....(اس کے بعد اسماعیل ریحان صاحب نے نماز کی ایک مثال پیش کی ہے اور پھر لکھا ہے)

"اسی طرح مشاجرات میں ایک فریق پر "صورت بغاوت" کا اطلاق ان معنوں میں کیا جا رہا ہے کہ بغاوت عام طور پر ہوس اقتدار، لوٹ مار اور مار دھاڑ جیسی برائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے، ان برائیوں کو ہم

بغاوت کی روح کہہ سکتے ہیں، مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معاملے میں ایسا قطعاً نہیں تھا، وہاں نہ کوئی لوٹ مار تھی، نہ سرکشی، حرص دنیا تھی نہ ہوس اقتدار، وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے فکر آخرت سے مجبور ہو کر اللہ کو راضی کرنے کرنے کے لیے کر رہے تھے پس وہاں بغاوت کی فقط ظاہری شکل تھی، جس پر شرعی احکام تو لاگو ہونے تھے مگر روح بغاوت مفقود تھی...الخ" ①

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۰۷۔۸۰۸.

اسماعیل ریحان صاحب کے ساتھ میری ایک ملاقات کا حال

یہاں میں جناب اسماعیل ریحان صاحب کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، آج سے کوئی دو اڑھائی سال قبل کی بات ہے راولپنڈی میں ہونے والے ختم نبوت کے ایک پروگرام میں اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں جس کے ہال میں پروگرام ہو رہا تھا، مجھے اسماعیل ریحان صاحب کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کا موقع ملا، جو کھانے کے دسترخوان پر بھی جاری رہا، بات شروع ہوئی ان کے کالموں سے اور مشاجرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آ گئی، گفتگو کے آخر میں، میں نے سوال کیا کہ:

" آپ کے تمام ارشادات سے میں یہ سمجھا ہوں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اختلاف ہوا اور نوبت جنگوں تک پہنچ گئی، وہ سب تو تھے "حقیقی طور پر باغی" ہی، لیکن چونکہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، اس لئے بعد والوں نے ان کے مرتبہ صحابیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ" ان سے اجتہادی غلطی ہو گئی تھی" ؟

تو اسماعیل ریحان صاحب نے فرمایا: جی! بالکل ایسا ہی ہے۔

الغرض! اسماعیل ریحان صاحب کا یہی کہنا ہے کہ یہ حضرات حقیقی اور شرعی باغی تھے، اور جس نے انہیں" صورتاً باغی" بھی کہا ہے اس کی مراد بھی اس بغاوت

کے اصطلاحی بغاوت ہونے کا انکار نہیں..

نیز اسماعیل ریحان صاحب ہمیں یہ بھی بتا آئے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بعد میں ان "حقیقی وشرعی واصطلاحی باغیوں" کے ساتھ سرحدوں کے احترام کا معاہدہ بھی کرتے ہیں۔ ①

بلکہ لکھتے ہیں کہ:

"۴۰ ہجری کے دوران سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہوا، مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ان کی شہادت تک نہیں کی گئی"۔ ②

جس سے ثابت ہوا کہ (اسماعیل ریحان صاحب کے مطابق) ان "حقیقی باغیوں" نے اپنی بغاوت سے توبہ نہیں کی تھی، لیکن اس کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک معاہدہ کے تحت کئی علاقوں پر ان کی حکومت منظوری فرمالی تھی۔

نیز وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

"تحکیم کے بے نتیجہ ہونے سے، عراق اور شام کے ایک پرچم تلے آنے کے امکانات بظاہر ختم ہوگئے، لہٰذا دو ماہ بعد ذی قعدہ ۳۷ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ ایک حکمران کے طور پر اہل شام سے بیعت لی اور اپنی باضابطہ حکومت کا اعلان کردیا"۔ ③

اسی بات کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا کہ:

"مجلس تحکیم کے بے نتیجہ ہونے کے بعد جب ذوالقعدہ ۳۷ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے مستقل حکمران کے طور پر رعایا سے

① دیکھیں: تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۶۸۔۲۶۹ زیر عنوان ''سرحدوں کے احترام کا معاہدہ''
② حوالہ مذکورہ ص ۷۷۶.
③ حوالہ مذکورہ ص ۲۵۷.

بیعت لی تو شام کا ایک الگ ریاست وحکومت کے طور پر تشخص مزید ابھر آیا"۔ ①

اور خود اسماعیل ریحان صاحب یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

"بغاوت کا مرتکب سخت سزا کا مستحق ہے. بغاوت سنگین جرم ہے، حکمران کی موجودگی میں کسی دوسرے حکمران کی بیعت درست نہ ہوگی بلکہ بیعت کرنے اور لینے والا دونوں قابل سزا ہوں گے، ارشاد نبوی ہے: اذا بُویع لخلیفتین فاقتُلوا الآخر منهما . جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کردو"۔ ②

تو سوال یہ ہے کہ اگر بغاوت سنگین جرم ہے، اور اس کا مرتکب سخت سزا کا مستحق ہے، اور ایک حکمران کی موجودگی میں دوسرے حکمران کی بیعت کرنے والا اور لینے والا دونوں قابل سزا ہوتے ہیں، اور حدیث نبوی کی رو سے دوسرے حکمران کو قتل کر دینے کا حکم ہے اور بقول اسماعیل ریحان صاحب، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنہ ۳۷ ہجری میں شام کے مستقل حکمران کے طور پر بیعت بھی لی تھی، تو کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے "حقیقی باغیوں" کو ان کے جرم پر سنگین سزا دینے کے بجائے، خود خلیفہ ہوتے ہوئے، سنہ ۴۰ ہجری میں ایسا معاہدہ فرمایا جس کی رو سے ایک ہی ریاست میں دو حکمران بن گئے؟؟

اس گتھی کو کون سلجھائے گا؟

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۲۶۸.

② حوالہ مذکورہ ج ۱ ص ۶۲۲.

" صورتاً " بغاوت کا مطلب کیا؟

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ" یہ بغاوت صورتاً تھی نہ کہ حقیقتاً" ، ان کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟

ہم زیادہ دور نہیں جاتے ، اسماعیل ریحان صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک قابل اعتماد اور وکیل صحابہ رضی اللہ عنہم کا لقب پانے والی شخصیت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوالی رحمہ اللہ کی چند عبارات یہاں نقل کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

" انہوں (یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ۔ ناقل) نے اپنے اجتہاد کی بنا پر علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا لیکن اس میں ان سے اجتہادی خطا ہو گئی، اس لئے ان کو حقیقتاً باغی نہیں کہہ سکتے، اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ بھی ان کو حقیقتاً باغی نہیں قرار دیتے تھے، اس لئے منازعت کو ختم کرنے کے لئے ثالثی قبول کی، ورنہ اگر آپ ان حضرات کو حقیقتاً باغی اور اہل باطل سمجھتے تو حسب ارشاد ربانی آپ پر لازم تھا کہ جب تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت آپ کی اطاعت نہ کرتی، آپ جنگ کرتے رہتے، اسی بنا پر میں نے خارجی فتنہ حصہ اول میں کئی مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بغاوت صورتاً تھی نہ کہ حقیقتاً...." ①

① دفاع سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، ص ۲۷، طبع سنی اکیڈمی چکوال، سن اشاعت ۲۰۰۸.

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"البتہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہوں یا حکمین یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ان کے لیے یہ اجتہادی مسئلہ تھا، کیونکہ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ آیت استخلاف اور آیت تمکین کا مصداق سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ ہیں، چنانچہ بندہ نے خارجی فتنہ حصہ اول صفحہ ۵۲۲ پر بھی لکھ دیا ہے کہ: یہ صحیح ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں اس قسم کے اختلاف کا حق رکھتے تھے، لیکن یہ اس بنا پر تھا کہ اس وقت تو قطعی طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی قرآن کے (موعودہ) خلیفہ راشد ہیں. علاوہ ازیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے میں لکھ دیا تھا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موعودہ خلیفہ راشد ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے لیکن دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ نصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیش نظر نہ تھیں کیونکہ آیت وحدیث میں خلفاء اربعہ کے نام نہیں تھے، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کی بنا پر اپنا اپنا موقف اختیار کرلیا...الخ" ①

پھر حضرت قاضی صاحب، سید لعل شاہ بخاری ② کی ایک عبارت یوں نقل کرتے ہیں:

"اور اس نظریہ کو حق وصواب سمجھیں کہ اس مقاتلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ

① حوالہ مذکورہ ص ۲۹.

② مصنف "استخلاف یزید"۔ ناقل.

حق پر تھے اور ان کے محاربین فی الحقیقت باطل پر تھے، مگر انہوں نے باطل پر قصد نہیں کیا تھا بلکہ حق کا قصد کر کے اجتہاد کیا تھا مگر حق کو نہ پا سکے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے"۔ ①

اس پر رد کرتے ہوئے حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"جب مولانا لعل شاہ صاحب محاربین علی رضی اللہ عنہ کا اجتہاد مانتے ہیں تو ان کو حقیقتاً باطل پر قرار دینا غلط ہے، کیونکہ اجتہادی اختلاف میں صواب وخطا کا تقابل ہوتا ہے نہ کہ حق و باطل کا، وہ صورتاً باطل پر تھے نہ کہ حقیقتاً، آخر کیا سیدنا آدم علیہ السلام سے معصیت اور غوایت حقیقی کا صدور ہوا تھا"۔ ②

پھر غور سے پڑھیں، حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ صریح طور پر لکھتے ہیں:

"ثالثی کی تجویز قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو حقیقتاً باغی نہیں قرار دیتے تھے ورنہ جب تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، آپ کی اطاعت نہ قبول کر لیتے آپ جنگ جاری رکھتے"۔ ③

اب اسماعیل ریحان صاحب بتائیں کہ کیا وہ حضرت قاضی صاحب کی اس بات سے متفق ہیں کہ ''اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، ان حضرات کو حقیقی وشرعی واصطلاحی باغی ہی سمجھتے تو ان کا ثالثی کی تجویز قبول کرنا درست نہیں رہتا؟؟''

آگے چلیں، حضرت قاضی صاحب لکھتے ہیں:

---

① استخلاف یزید، ص ۱۸۹.

② دفاع سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، ص ۴۵.

③ حوالہ مذکورہ ص ۵۱۵۰.

" یہی جواب میں نے مودودی صاحب کو دیا ہے کہ جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو حقیقتاً باطل پر قرار دیتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہے:

" خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باغی ہونے کا وہی حکم تھا جو مجتہد مخطی (خطا کرنے والے) کا ہوتا ہے، کیونکہ آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فریقین کی طرف سے ایک ایک حکم (ثالث) مقرر کرنے کی تجویز قبول کر لی تھی جس کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ثالث مقرر کیے گئے تھے، اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس معنی میں باغی ہوتے جس معنی میں مودودی گروہ منوانا چاہتا ہے یعنی بالکل باطل پر ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے حکمین کی تجویز قبول کرنا ناجائز تھا کیونکہ قرآن کریم میں باغی گروہ کے متعلق صریح حکم ہے ... وَاِنْ طٰٓئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا .. (اس آیت میں یہ حکم ہے کہ بغاوت کرنے والے گروہ سے اس وقت تک جنگ کرنی ہے جب تک وہ اپنی بغاوت سے باز آکر اللہ کے حکم کی طرف نہ لوٹ آئے۔ ناقل)، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مساوی درجہ دے کر اپنا معاملہ ثالثوں کے سپرد کر دیا اور لطف یہ ہے کہ ہر دو ثالثوں نے اپنے فیصلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کر دیا، حالانکہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قطعاً حق پر سمجھا جاتا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باطل پر تو پھر خلیفہ حق کو معزول کرنا

کیوں کر جائز ہوسکتا تھا"۔ ①

قارئین محترم! حضرت قاضی مظہر حسین صاحب رحمہ اللہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے لکھا کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حقیقی طور پر باغی نہ تھے، بلکہ ان کی بغاوت صورتاً تھی"، لیکن اسماعیل ریحان صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ:

" جہاں تک صورتاً بغاوت یا بظاہر بغاوت کی تعبیر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصطلاحی بغاوت کا انکار کیا جا رہا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے اقدامات میں" روح بغاوت" موجود نہ تھی فقط اس کا ڈھانچہ تھا...."

یعنی اسماعیل ریحان صاحب کے نزدیک ان حضرات کے نزدیک بھی یہ "حقیقی وشرعی واصطلاحی بغاوت" ہی تھی، صرف" روح بغاوت" نہ تھی اس لیے اسے صورتاً کے لفظ سے بیان کر دیا جاتا ہے۔

لیکن حضرت قاضی مظہر صاحب رحمہ اللہ اپنے کہے کا یہ مطلب نہیں بتا رہے، بلکہ وہ یہ بتا رہے ہیں کہ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، بھی اسے حقیقی واصطلاحی بغاوت سمجھتے تو وہ کبھی بھی ثالثی کی تجویز قبول نہ فرماتے اور نہ ہی اس وقت تک جنگ روکتے جب تک بغاوت کے مرتکب حضرات اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ جاتے کیونکہ (حقیقی واصطلاحی وشرعی) باغیوں کے بارے میں یہی حکم قرآن میں بیان ہوا ہے۔

دراصل اسماعیل ریحان صاحب نے" سید لعل شاہ صاحب" والا نظریہ اپنایا ہوا ہے، جس نظریہ کی نام لے کر حضرت قاضی صاحب نے یوں تردید فرمائی ہے کہ:

---

① دفاع سیدنا معاویہ، ص ۵۱.

"جب مولانا لعل شاہ صاحب محاربین علی رضی اللہ عنہ کا اجتہاد مانتے ہیں تو ان کو حقیقتاً باطل پر قرار دینا غلط ہے، کیونکہ اجتہادی اختلاف میں صواب وخطا کا تقابل ہوتا ہے نہ کہ حق و باطل کا، وہ صورتاً باطل پر تھے نہ کہ حقیقتاً، آخر کیا حضرت آدم علیہ السلام سے معصیت اور غوایت حقیقی کا صدور ہوا تھا"۔ ①

یہاں اہم بات حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کا حضرت آدم علیہ السلام کی مثال دینا ہے، اس پر غور کیا جائے۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ خود اسماعیل ریحان صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"....جنگ صفین کے تمام مقتول صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ اجتہاد کے تحت ہونے والی ایک جنگ کے شہداء ہیں، اس جنگ میں قاتلوں کو گناہ گار مانا جائے گا نہ مقتولین کو، ان شاء اللہ سب ہی ماجور اور مغفور ہیں"۔ ②

کیا یہاں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ کیا "حقیقی وشرعی واصطلاحی بغاوت" کے مرتکب "مجتہد" ہوتے ہیں؟ اور ان کے مقتولین کو "شہداء" کہا جائے گا؟ اور ان سب کو ماجور ومغفور مانا جائے گا؟؟

---

① دفاع سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، ص ۴۵۔
② تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۷۷۷۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی فقاہت وبصیرت

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں کہ:

(جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، ضلع کوفہ کی سرحد تک پہنچے تو یہیں ابن زیاد کے سالار حُرّ بن یزید سے ملاقات ہوئی)

"حُرّ بن یزید ایک شریف آدمی تھا، اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کی، پوچھا: کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ جب آپ نے کوفہ کا ارادہ بتایا تو حُرّ نے سختی سے منع کیا اور کہا: واپس چلے جایئے، وہاں سے آپ کے لیے خیر کی کوئی امید نہیں. ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس دمشق جانے کا فیصلہ کیا، یہ فیصلہ اتنا اٹل تھا کہ آپ کسی تردد کے بغیر فوراً اس پر عمل پیرا ہو گئے اور شام کا راستہ اختیار کر لیا۔ لائحہ عمل میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی فقاہت وبصیرت کی بدولت مسئلے کی نوعیت بدلتے دیکھ لی تھی، آپ سمجھ چکے تھے کہ یزید کی حکومت قائم و مستحکم ہو چکی ہے، لہٰذا ایک قائم شدہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش اب خروج اور بغاوت کے زمرے میں آئے گی، لہٰذا آپ نے شرعی حدود میں رہتے ہوئے متبادل راستے کو ترجیح دی اور چاہا کہ دمشق جا کر یزید سے ملاقات کی جائے.....

(آگے لکھا).....آپ دمشق کے راستے پر تقریباً ۴۵ میل (ساڑھے

۷۲ کلومیٹر) سفر کر کے آخر کربلا تک جا پہنچے، جو کوفہ سے دمشق جانے والی شاہراہ پر واقع ہے، یہاں دریائے فرات کا کنارہ قریب تھا جسے الطّف کہا جاتا تھا۔ ①

(پھر اسماعیل ریحان صاحب دو صفحات کے بعد لکھتے ہیں)

"میدان کربلاء میں سرکاری فوج کے افسران عمر بن سعد، شمر ذی الجوشن اور حُصین بن نُمیر کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بات چیت ہوئی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کو اللہ اور دین کا واسطہ دیا اور کہا:

"مجھے امیر المؤمنین کے پاس جانے دو، میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا"۔ ②

اسی صفحے کے حاشیہ میں جناب اسماعیل ریحان صاحب نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کو "امیر المؤمنین" کہنے اور "اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے" کو بیان کرنے والی روایت کو "بسند صحیح" (صحیح سند والی) لکھا ہے اور پھر اسی حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

"یہ لفظ ضرور ثابت کر رہا ہے کہ آخر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک زمینی حقیقت کے طور پر بطور تسلط یزید کی حکومت کے قیام کو مان لیا تھا، اگر یزید سے مذاکرات ہوتے اور وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شرائط مان جاتا تو غالباً اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بیعت سے بھی انکار نہ ہوتا جیسا کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کا لفظ اس کی دلیل ہے..." ③

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۴۸۱ و ۴۸۲.

② حوالہ مذکورہ ص ۴۸۴.

③ حوالہ مذکورہ، ص ۴۸۴ حاشیہ.

تبصرہ:

جناب اسماعیل ریحان صاحب کے ان اقتباسات سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، جب عراق پہنچے اور وہاں کے زمینی حقائق آپ کے علم میں آئے تو آپ نے اپنی فقاہت وبصیرت سے اپنے سابقہ موقف میں تبدیلی فرمالی اور اس پر عمل فرماتے ہوئے اپنا رخ بھی دمشق کی طرف موڑ لیا، نیز آپ نے یہاں تک تجویز پیش فرمادی کہ مجھے "امیر المؤمنین" کے پاس جانے دو، تاکہ میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دوں، اور لائحہ عمل میں اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی فقاہت وبصیرت کی بدولت مسئلے کی نوعیت بدلتے دیکھ لی تھی، آپ سمجھ چکے تھے کہ یزید کی حکومت قائم ومستحکم ہو چکی ہے، لہٰذا ایک قائم شدہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش اب خروج اور بغاوت کے زمرے میں آئے گی۔

سوال یہ ہے کہ جناب اسماعیل ریحان صاحب کا یہ تجزیہ اور موقف، درست ہے یا غلط؟ اور کیا اسے قبول کیا جاسکتا ہے؟ کیا ان پر "یزیدی" کا فتویٰ تو نہیں لگے گا؟، کیا آج اپنے آپ کو اہل سنت کا ٹھیکیدار" سمجھنے والے وہ لوگ جو بات بات پر دوسروں پر" یزیدی" کے فتوے لگاتے ہیں وہ اس موقف سے متفق ہیں؟

مروان بن حکم کا ابن زیاد کو خط

پھر اسی سانحۂ کربلاء کو بیان کرتے ہوئے جناب اسماعیل ریحان لکھتے ہیں:

(مروان بن حکم نے عراق کے گورنر ابن زیاد کو یہ خبر بھیجی تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تمہاری طرف آرہے ہیں مگر ساتھ ہی اس مسئلے کو احتیاط سے حل کرنے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کا خیال رکھنے کی نصیحت کی تھی.....مروان نے لکھا تھا:)

"یہ حسین رضی اللہ عنہ، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں، اللہ کی قسم! ہمیں حسین سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، خبردار! جوش میں آکر کچھ ایسا نہ کر بیٹھنا جس کی تلافی نہ ہو سکے اور لوگ اسے فراموش نہ کر سکیں۔

مروان کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے سنجیدہ و جہان دیدہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے مگر افسوس کہ عبید اللہ بن زیاد نے ایسے لوگوں کے مشورے پر کان نہ دھرا...." ①

اور ایک دوسری جگہ لکھا:

''مروان، عبد الملک اور اس طرح کے کئی افراد، سیرت و کردار اور اخلاق و اوصاف میں بعد والوں سے بہت بہتر تھے، مگر سیاسی امور

① تاریخ امت اسلامیہ، ج ۲ ص ۴۷۹.

میں ان سے جو غلطیاں ہوئیں وہ اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکیں''۔ ①

لیکن یہی اسماعیل ریحان صاحب، آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مروانی وہی لوگ تھے جو بعد میں ناصبی کہلائے، چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم میں مروان کا کردار نمایاں تھا اس لئے شروع میں یہ گروہ اسی نام سے موسوم ہوا''۔ ②

اشکال یہ ہے کہ جناب اسماعیل ریحان صاحب نے جس" مروان" کا پہلے ذکر کیا ہے جس نے عراق کے گورنر ابن زیاد کو خط لکھ کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی تھی اور جس سے اسماعیل ریحان صاحب نے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ:" مروان کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوامیہ کے سنجیدہ و جہان دیدہ لوگ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے" نیز جس" مروان" کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:" مروان، عبدالملک اور اس طرح کے کئی افراد، سیرت وکردار اور اخلاق واوصاف میں بعد والوں سے بہت بہتر تھے"، کیا یہ" مروان" وہی ہے جس کا ذکر آخری عبارت میں کیا گیا ہے کہ:" مروانی وہی لوگ تھے جو بعد میں ناصبی کہلائے، چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم میں مروان کا کردار نمایاں تھا اس لئے شروع میں یہ گروہ اسی نام سے موسوم ہوا"؟؟ اور جس کے نام کی طرف نسبت کر کے اسماعیل ریحان صاحب اپنی اسی کتاب میں بار بار اپنے مخالفین کو" مروانی ناصبی" لکھتے ہیں یا یہ دو الگ الگ" مروان" تھے؟؟

عجیب کھچڑی پکائی گئی ہے، کہیں مروان، یہ کہتے پایا گیا کہ ہمیں سیدنا

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲، ص ۶۳۶.

② حوالہ مذکورہ ص ۹۰۰ حاشیہ.

حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، اور کہیں اسے سیرت و کردار میں اپنے بعد والوں سے (جن میں عمر بن عبدالعزیز بھی ہیں) بہت بہتر بتایا۔۔

اور پھر اسی کو ناصبی لوگوں کا موجد بتایا جا رہا ہے۔۔۔؟؟

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت، امت کے بہترین فرد کو ملی؟

جناب اسماعیل ریحان صاحب لکھتے ہیں:

"...حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ایک متوازی غیر آئینی حکومت تھی، دونوں حکومتوں کے سربراہوں کی خواہش یہی تھی کہ امت مسلمہ ایک خلیفہ پر متفق ہو جائے، مگر ایسے میں امت مسلمہ کے نمائندہ اکابر صحابہ کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ امت مسلمہ کے بہترین فرد کا انتخاب کرتے، ورنہ سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے حضرات، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے تھے، اور خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت کسی شک وشبہے سے بالاتر تھی"۔ ①

تبصرہ:

یہاں اسماعیل ریحان صاحب جو کہنا چاہتے ہیں اسے سمجھنے کے لیے غور کرنے کی ضرورت ہے، وہ دراصل یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ امت کے بہترین فرد نہیں تھے، اور جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے دست برداری کے بعد خلافت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی تو اس وقت امت مسلمہ کے نمائندہ اکابر صحابہ کو خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا، اگر ایسا موقع دیا جاتا تو ایسے صحابہ موجود تھے جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے فضیلت میں بڑھ کر تھے، جیسے سیدنا سعد بن ابی

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۸۲۵.

وقاص، سیدنا سعید بن زید، سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم)، نیز اسماعیل ریحان صاحب نے یہ لکھا کہ صلح سے پہلے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حکومت تو آئینی تھی، جبکہ ان کے مقابل سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک غیر آئینی متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔

اب ان سوالوں کے جواب درکار ہیں:

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امت مسلمہ کے نمائندہ تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا بطور خلیفہ انتخاب کیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو ان اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام بتائے جائیں، بالفاظ دیگر ان اصحاب حل وعقد کے نام بتائے جائیں جنہوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔

کیا مثلاً سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ جو دونوں ہی سابقون اولون مہاجرین میں سے ہیں، دونوں ہی بدری صحابی ہیں، دونوں ہی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، وہ مرتبہ ومقام میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نہیں تھے؟، بلکہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تو ان چھ حضرات میں بھی شامل تھے جنہیں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کیا تھا، تو کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امت کے ان بہترین افراد کو چھوڑ کر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرنا غلط تھا؟ اور اگر یہ حضرات سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے تھے، تو کیا یہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے نہ تھے؟

لہٰذا! اسماعیل ریحان صاحب کو بار بار یہ باور کروانے سے پہلے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تو خلافت کے لئے بہترین فرد نہیں تھے، یہ سوچنا چاہیے تھا کہ انہی کی منطق کی رو سے یہی بات کوئی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ

بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد موجود صحابہ کرام میں مرتبہ و مقام میں سب سے بڑھ کر نہیں تھے، بلکہ ان سے مرتبہ و مقام میں کہیں بڑھ کر دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، ہمیں یقین ہے کہ اگر کوئی ایسا طرز بیان سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں اختیار کرے تو اسماعیل ریحان صاحب اس پر ناصبیت کا فتویٰ لگا دیں گے، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو" ڈی گریڈ" کرنے کے لیے وہ ایسی عبارات لکھنے سے نہیں چوکتے۔

کیا اپنے خودساختہ مفروضوں کا نام تاریخ ہے؟

اسماعیل ریحان صاحب صحیح بخاری وغیرہ میں مروی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک معروف خطبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خاص حضرات کے سامنے ایک تقریر کی صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس تقریر کا چشم دید حال یوں سنایا: جب لوگ بکھر گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خطبہ دیا.....'' (الی آخر الروایۃ، حاشیہ میں صحیح بخاری کی روایت نمبر:۴۱۰۸ کا حوالہ دیا ہے)۔①

پھر حاشیہ میں اس پر ایک لمبی چوڑی بحث کی ہے اور آخر میں نتیجہ نکالا ہے کہ:

"اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر خلافت کا عہدہ لیتے ہوئے عراق میں کی تھی، مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ ۴۱ ہجری کا واقعہ ہے....."۔②

اور ایک دوسری جگہ اسی خطبہ کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے خلافت کے افتتاحی خطبے میں

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۴۲۔۳۴۳ مع حاشیہ.
② حوالہ مذکورہ ص ۳۴۴.

گزشتہ حکمران پر جو تعریض کی گئی تھی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس پر بر افروختہ ہونے کے باوجود خاموش رہے تاکہ اتفاق میں کوئی رخنہ نہ ہو"۔ ①

غور فرمائیں! جناب اسماعیل ریحان صاحب نے بڑے یقین کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ یہ خطبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد دیا تھا، اور پھر بڑی ہوشیاری سے یہ الفاظ لکھ کر کہ:

"اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر خلافت کا عہدہ لیتے ہوئے عراق میں کی تھی، مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ ۴۱ ہجری کا واقعہ ہے"۔

یہ تأثر دینے کی بھی کوشش کی کہ جیسے تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ خطبہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے صلح کے بعد خلیفہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد دیا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسماعیل ریحان صاحب کا ہی کمال ہے انہوں نے قطعی طور پر اس خطبہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد" افتتاحی" یعنی پہلا خطبہ بنا ڈالا، ورنہ ایک دوسری صحیح روایت میں یہ بات صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ یہ خطبہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کا ہے، اسی روایت کی بنیاد پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، صحیح بخاری کی اسی روایت کے تحت لکھتے ہیں:

"وَوَقَعَ فِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ فِي هَذَا الْحَدِيثِ فَلَمَّا تَفَرَّقَ الْحَكَمَانِ وَهُوَ يُفَسِّرُ الْمُرَادَ وَيُعَيِّنُ أَنَّ الْقِصَّةَ كَانَتْ

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۶۶۸.

بِصِفِّينَ وَجَوَّزَ بَعْضُهُمْ أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ الِاجْتِمَاعَ الْأَخِيرَ الَّذِي كَانَ بَيْنَ مُعَاوِيَةَ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَرِوَايَةُ عَبْدِ الرَّزَّاقِ تَرُدُّهُ وَعَلَى هَذَا تَقْدِيرُ الْكَلَامِ فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى ذَهَبَ إِلَيْهِمْ فِي الْمَكَانِ الَّذِي فِيهِ الْحَكَمَانِ فَحَضَرَ مَعَهُمْ فَلَمَّا تَفَرَّقُوا خَطَبَ مُعَاوِيَةُ إِلَخْ وَأَبْعد من ذَلِك قَول بن الْجَوْزِيِّ فِي كَشْفِ الْمُشْكِلِ أَشَارَ بِذَلِكَ إِلَى جَعْلِ عُمَرَ الْخِلَافَةَ شُورَى فِي سِتَّةٍ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ مِنَ الْأَمْرِ شَيْئًا فَأَمَرَتْهُ بِاللِّحَاقِ قَالَ وَهَذَا حِكَايَةُ الْحَالِ الَّتِي جَرَتْ قَبْلُ وَأَمَّا قَوْلُهُ فَلَمَّا تَفَرَّقَ النَّاسُ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ كَانَ هَذَا فِي زَمَنِ مُعَاوِيَةَ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَجْعَلَ ابْنَهُ يَزِيدَ وَلِيَّ عَهْدِهِ كَذَا قَالَ وَلَمْ يَأْتِ لَهُ بِمُسْتَنَدٍ وَالْمُعْتَمَدُ مَا صَرَّحَ بِهِ فِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ..."①

خلاصہ: عبدالرزاق نے معمر کے واسطے سے جو روایت ذکر کی ہے اس کے مطابق اس حدیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ "جب حکمین الگ ہوئے" یوں ان الفاظ نے مراد واضح کردی اور اس بات کی تصریح کردی کہ یہ واقعہ صفین کا ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے درمیان میں (صلح کے سلسلے میں) آخری ملاقات ہوئی تھی، لیکن عبدالرزاق کی روایت اس بات کو رد کرتی ہے.... اور اس سے بھی زیادہ بعید ابن جوزی کا قول ہے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس بات کا اشارہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی

① فتح الباري، جلد ۷، صفحہ ۴۰۳، دار المعرفة بيروت.

طرف سے بنائی گئی چھ رکنی شوری میں ان کا کوئی دخل نہ رکھنے سے متعلق تھا، اور دوسری بات کہ جب لوگ منتشر ہو گئے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، یہ اس وقت سے متعلق ہے جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا تھا (ابن حجر کہتے ہیں) ابن جوزی نے اس بات کی کوئی مستند دلیل نہیں پیش کی، لہٰذا قابل اعتماد بات وہی ہے جس کی تصریح عبدالرزاق کی روایت میں ہے۔

یوں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے پہلے تو اس قول کا رد کر دیا جس میں اس واقعہ کو سیدنا معاویہ اور سیدنا حسن (رضی اللہ عنہما) کے درمیان صلح کے وقت کا بتایا گیا تھا، اس کے بعد" ابن جوزی" کی بات کو اس سے بھی زیادہ بعید بتا کر اس کا بھی رد کر دیا، رہی مصنف عبدالرزاق کی وہ روایت جس کی طرف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:

"عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ مَعْمَرٌ: وَأَخْبَرَنِي ابْنُ طَاوُسٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ وَنَوَاصِيهَا تَنْطِفُ، فَقُلْتُ: قَدْ كَانَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ مَا تَرَيْنَ، وَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ قَالَتْ: فَالْحَقْ بِهِمْ، فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ، وَالَّذِي أَخْشَى أَنْ يَكُونَ فِي احْتِبَاسِكَ عَنْهُمْ فُرْقَةٌ. فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى يَذْهَبَ، فَلَمَّا تَفَرَّقَ الْحَكَمَانِ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ فَقَالَ: مَنْ كَانَ مُتَكَلِّمًا فَلْيُطْلِعْ قَرْنَهُ"۔ ①

① مصنف عبدالرزاق، جلد ۵، صفحہ ۴۸۳، حدیث نمبر: ۹۷۷۹.

آپ نے دیکھا کہ اس روایت میں صاف طور پر "فلما تفرق الحکمان" کی صراحت ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان تحکیم ہو رہی تھی، اور اس وقت تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے یا یزید کی ولی عہدی یا بیعت کا دور دور تک کہیں کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔

یاد رہے! جب ایک حدیث کی تشریح دوسری صحیح حدیث سے ہو جائے تو وہاں کسی شارح کے اپنے قول کی ضرورت نہیں رہتی، اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی لیے اسی قول کو صحیح فرمایا ہے جس کی تائید مصنف عبدالرزاق کی یہ روایت کر رہی ہے، لہٰذا بعض لوگوں کا اس واقعہ کو یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے ساتھ جوڑنا بھی درست نہیں، اور ہم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسماعیل ریحان صاحب جیسے عالم کی نظر سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ بات اوجھل رہی ہوگی۔

صحیح بخاری کے ایک اور شارح علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

"قَوْله: (فَلَمَّا تفرق النَّاس..)، أَي: بعد أَن اخْتلف الحكمان وهما أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيّ وَكَانَ حكما من جِهَة عَليّ، ، وَعَمْرو بن الْعَاصِ رضی اللہ عنہم وَكَانَ حكما من جِهَة مُعَاوِيَة" ①

یعنی" جب لوگ منتشر ہو گئے" سے مراد اس اختلاف کے بعد لوگوں کا منتشر ہونا ہے جو حکمین کے درمیان ہوا، اور حکمین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔

---

① عمدۃ القاری، ج ۱۷ ص ۱۸۵، دار احیاء التراث العربی بیروت .

لہٰذا اسماعیل ریحان صاحب نے اس واقعہ کو قطعیت کے ساتھ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد پہلا خطبہ بتا کر اور ایسی عبارت لکھ کر جس سے معلوم ہو کہ اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے وہی غلطی کی ہے جو وہ لوگ کرتے ہیں جو اس خطبہ کو یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے وقت کے ساتھ جوڑتے ہیں۔

اسماعیل ریحان صاحب کا عجوبہ

اسماعیل ریحان صاحب نے صحیح بخاری کی اس روایت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"راوی حبیب بن مسلمہ کہتے ہیں....." ①

آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"...اسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرنے والے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ....." ②

آگے لکھتے ہیں:

"اس قصے کو نقل کرنے والے راوی حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ خود ۴۲ ہجری میں یقینی طور پر فوت ہو چکے تھے..." ③

جب کہ صحیح بخاری کی اس روایت کی سند میں حبیب بن مسلمہ نام کے کوئی راوی نہیں ہیں۔

---

① تاریخ امت مسلمہ، ج ۲ ص ۳۴۳.

②③ حوالہ مذکورہ ص ۳۴۴ حاشیہ.

مولانا محمد اسماعیل ریحان کی تاریخ امت مسلمہ کا تحقیقی جائزہ

(حصہ اوّل)

ادارے کی دیگر کتب

① امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی ولی عہدی مع واقعہ حرہ، تصویر کا دوسرا رخ
تالیف حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا مطلوب الرحمٰن ندوی نگرامی

② اہل سنت اور محرم الحرام — تالیف حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

③ اسلامی خلفاء وملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ
تالیف حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

④ امیر حجاج بن یوسف ثقفی رحمہ اللہ چند غلط فہمیوں کا ازالہ — تالیف وترتیب محمد فہد حارث

⑤ اولیاء اللہ اور تصوف — تالیف علامہ عبدالسلام مبارکپوری

⑥ وقائع دلپذیر بادشاہ بیگم اودھ (جلد اول) — تالیف عبدالاحد رابط

⑦ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مذہبی پہلو (جلد دوم) — تالیف پروفیسر محمد ایوب قادری

⑧ وبائی امراض اور جمعہ وجماعت پر پابندی — تالیف ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

⑨ جدید سبائی گروہ کا علمی تعاقب — تالیف حافظ عبید اللہ

⑩ حیات سیدنا یزید رحمہ اللہ — تالیف ابوالحسین عظیم الدین صدیقی

⑪ خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ ویزید رحمہ اللہ — تالیف علامہ محمود احمد عباسی رحمہ اللہ

⑫ داؤدی بوہرے ایک اجمالی تعارف — تالیف محمد فہد حارث

⑬ دین تصوف — جمع وتدوین: محمد فہد حارث

⑭ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی — تالیف مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

⑮ خلیفہ راشد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر سو اعتراضات کا علمی تجزیہ — تالیف پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

⑯ سیرۃ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (اتہام وشیعیت کی حقیقت) — تالیف مولانا علی احمد عباسی رحمہ اللہ

⑰ فضائل صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم اور مسائل واقعات محرم الحرام — تالیف حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ

⑱ شہید کربلا اور کردار یزید کا علمی وتحقیقی جائزہ — تالیف حافظ عبید اللہ

⑲ تاریخ شاہان عالم — تالیف ابوحیان ظہیر الدین بابر

حارث پبلی کیشنز

Email: haris.publications@gmail.com

حارث پبلی کیشنز